پریم چند - ایک نقیب
(نیا ایڈیشن)
ڈاکٹر صغیر افراہیم

اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند کی معاشرتی فکر بہت بالغ ہے۔ وہ مذہب اور معاشرے کے نام پر قدامت پرستانہ خیالات کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ وہ فرسودہ رسوم ورواج کے بھی شدید مخالف ہیں۔ معاشرے میں مذہب کا کردار آج کیا ہونا چاہیئے، اِس موضوع پر وہ بہت بے باکانہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ پریم چند کا سارا ادب ہندوستانی معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کا علامیہ ہے۔ وہ سماجی تنظیموں کے حدود اور صلاحیتوں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے کردار پر خط کھینچتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محض اصلاحِ معاشرہ سے سماج کے پسماندہ طبقہ کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے اقتصادی اور سیاسی نظام میں مثبت تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ ان کے یہاں فکر و عمل کے درمیان خلیج بہت کم ہے۔ سماجی تنظیموں کی خدمات کا پریم چند نے اپنے ادب میں احاطہ کیا ہے لیکن ان کے حدود پر بھی حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اِن ہی نکات کو "پریم چند۔ ایک نقیب" میں بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ ان کی اس کاوش کی دانشوروں کے حلقہ میں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ عرصہ سے یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں تھی۔ اب ڈاکٹر صغیر افراہیم اِسے اردو میں دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ پریم چند کو سمجھنے میں یہ کتاب بہت مدد دیتی ہے۔

پریم چند کا عہد قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر تغیرات اور تبدیلیوں کا عہد ہے۔ ان تغیرات کے بطن سے پیدا ہونے والی تحریکوں نے بھی انھیں بجا طور پر متاثر کیا جن کے شواہد ان کے ادب میں کثرت سے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اس موضوع پر کافی غور و خوض کیا ہے اور اپنے طویل

(بقیہ دوسرے فلیپ پر)

ترمیم و اضافہ کے ساتھ

دوسرا ایڈیشن

ڈاکٹر صغیر افراہیم

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس ☆ علی گڑھ

نام کتاب	:	پریم چند - ایک نقیب
ناشر رمصنف	:	ڈاکٹر صغیر افراہیم
پتہ	:	شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
سالِ اشاعت	:	۱۹۹۹ء
		{ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء }
		{ ہندی ایڈیشن ۱۹۹۶ء }
تعداد	:	چارسو (۴۰۰)
قیمت	:	ایک سو اسّی روپے (Rs. 180/-)
طباعت	:	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔ 9897165496#
تقسیم کار	:	ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

Name of Book	:	Premchand-Ek-Naqib
Author & Publisher	:	Dr. Saghir Afraheim
Edition	:	1999
Price	:	Rs. 180/-
Distributors	:	Educational Book House Muslim University Market Aligarh-202002

"یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے"

دیباچہ

(طبع دوم)

''پریم چند--ایک نقیب'' کی ادبی حلقوں میں پذیرائی اور طلباء میں بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اِس کتاب کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر لایا جائے۔ دوسرے ایڈیشن کی ضرورت یوں بھی محسوس ہوئی کہ پہلے ایڈیشن میں جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کو دُور کر دیا جائے اور اِس موضوع پر پچھلے دس برسوں میں جو کچھ سوچا گیا ہے اس کا اضافہ بھی کر دیا جائے تا کہ کتاب کی افادیت اور معنویت اور بھی بڑھ جائے۔

مجھے امید ہے کہ ''پریم چند-ایک نقیب'' کا دوسرا ایڈیشن پہلے سے زیادہ پسند کیا جائے گا۔

صغیر افراہیم
شعبۂ اُردُو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

ترتیب مضامین

اس کتاب کا انتساب

اپنے محترم کرم فرما، جناب سید محمد رضوان حسین صاحب،
استاد، شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
کے صاحبزادے اور مادرِ درس گاہ علی گڑھ کے ایک فرزند،

برادر عزیز

رزمی رضوان حسین مرحوم

کے نام کرتا ہوں

جواں سال رزمی مرحوم پچیس سال کی عمر میں ۲۳ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو دہلی کی ایک سڑک پر حادثہ کا شکار ہوئے اور دس دن بیہوش رہ کر یکم جنوری ۱۹۸۲ء کو ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ علی گڑھ سے تاریخ میں ایم۔ اے۔ امتیازی حیثیت سے کرنے کے بعد، مرحوم جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اپنی تحقیقی مصروفیت کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بطور لکچرر کام کر رہے تھے۔

دیباچۂ اوّل

پریم چند صدی کے موقع پر، میں نے چند مضامین لکھے تھے جو مختلف رسائل میں شایع ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ان مضامین کو کتابی شکل دے کر "پریم چند — ایک نقیب" کے نام سے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومت اتر پردیش)، لکھنؤ کو روانہ کیا۔ کمیٹی نے مسودہ کی طباعت کے لیے مالی امداد منظور کی۔ مضامین کی کتابت کرائی گئی لیکن کتابت اتنی ناقص تھی کہ مجھے کتاب کی اشاعت ملتوی کرنا پڑی۔ ۱۹۸۶ء میں اس مسودہ کا خیال آیا تو اس میں چند کمیوں اور خامیوں کا احساس ہوا۔ مضامین کی دوبارہ تیاری میں کچھ وقت صرف ہوا۔ اب نظر ثانی کے بعد اس کو منظرِ عام پر لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔

"پریم چند — ایک نقیب" چار مضامین اور ایک سوانحی خاکہ پر مشتمل ہے۔ میں نے ان مضامین کے توسط سے پریم چند کی تخلیقات میں ان صحت مند رجحانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ پریم چند تمام عمر سماجی برائیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے اور ان برائیوں کے نتیجہ میں پیش آنے والے خطرات سے اپنے قاری کو آگاہ کرتے رہے۔ غلامی، طبقہ وارانہ نظام، انسانوں کے درمیان تفریق، سماجی ناانصافی، تعلیم کا فقدان، بعض غیر انسانی رسوم اور دیگر اخلاقی کمزوریاں اس عہد کے خاص مسایل تھے۔ قومی یکجہتی کو انھوں نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا جب کہ یہ آج بھی ملک کی اہم ضرورت ہے۔

پہلا مضمون "پریم چند پر مختلف تحریکوں کے اثرات" اپنی نوعیت کے اعتبار

سے کسی حد تک تحقیقی ہے۔ اس جانب قارئین کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ اس میں پریم چند کے عہد تک، میں نے برصغیر کی تقریباً ان تمام تحریکوں کا جائزہ لیا ہے جن کے اثرات انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیے یا ان کے ذہن پر مرتب ہوئے اور شاید میں نے پہلی بار پریم چند کے یہاں تحریک آزادیٔ وطن کے جانبازوں میں حضرت شاہ ولی اللہ کی 'تحریک مجاہدین' کے جاں نثاروں کا عکس دکھایا ہے۔ پریم چند کو تاریخی ناولوں کے غائر مطالعہ کا اعتراف ہے۔ یہ ناول عموماً مجاہدین کی سرفروشی پر مبنی ہوتے تھے۔ مجاہدین کی جانبازی سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے جس کی واضح جھلک ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی تھی۔ فارسی اور اردو سے تعلق تعلیم کے آخری مرحلوں تک رہا۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ بھی ان سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے۔ بے شمار یادیں[1] اس وقت تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی تحریکِ مجاہدین کے شرکا کی جانبازی سے اثر قبول نہ کیا ہو۔

میرا دوسرا مضمون 'ہوری — ایک علامتی کردار' پریم چند کے ناول گئودان سے متعلق ہے۔ یہ ناول مصنف کے عہد کے دیہی معاشرے کا فکشن میں ایک نہایت جامع عکس پیش کرتا ہے اور ان کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ تیسرا مضمون 'شاہکار تخلیق — کفن' پریم چند کے افسانوی سفر کی آخری منزل اور اردو افسانہ کی یادگار تخلیق 'کفن' پر لکھا گیا ہے۔ نفسیاتی حقیقت پر مبنی ان کا یہ افسانہ عمل اور ردِ عمل کے نتیجہ میں تعمیر شدہ شخصی کرداروں کی ڈھکی چھپی تہ بہ تہ ذہنی پرتوں کی نقاب کشائی

---

[1] بقول قبلہ عمو جان سید شاہ ابو محمد ثاقبؒ کانپوری پریم چند کانپور کے دورانِ قیام کبھی خانقاہ تشریف لے آتے تو حضرت کے والد بزرگوار حضرت سید شاہ محمد اکبرؒ، سجادہ نشین خانقاہ حضرت سید شاہ غلام رسول رسولنماؒ سے مختلف مذہبی معاملات و امور سے متعلق معلومات حاصل کرتے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے واقعات موضوعِ سخن ہوتے۔ علماء کی تحریکات سے بات میدانِ کربلا کے شہیدوں تک پہنچ جاتی۔

کرتا ہے۔ چوتھا مضمون "افسانہ نگار ـــــ پریم چند" ہے جو موصوف کی خدمات اور کاوشوں کے ضمن میں اس اجمالی تبصرہ پر منحصر ہے جن کا تعلق بالخصوص صنفِ افسانہ سے ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی بہ عنوان "مختصر سوانحی خاکہ" ہے جس میں اختصار کے ساتھ پریم چند کی زندگی کے اہم واقعات اور اردو ہندی دونوں زبانوں کی تخلیقات کے بارے میں تاریخ وار تقریباً تمام ضروری معلومات فراہم کرنے کی امکانی کوشش کی گئی ہے۔

صغیر افراہیم

کتاب گھر،
۷۳۔ قلعہ،
اناؤ ۲۰۹۸۰۱

"پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں میں ان کے عہد تک کے ہندوستان کی معاشی، سیاسی، طبقاتی اور عوامی کش مکش کا بڑا واضح اور تابناک نقشہ ملتا ہے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پریم چند پر مختلف تحریکوں کے اثرات

پریم چند ہندوستان کے عہد غلامی کے ادیب اور طلوع ہوتی ہوئی آزادی کے نقیب ہیں۔ اُس دور کے مسائل اور اُن کے تقاضے مخصوص تھے۔ آج اُن میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ وسائل میں اضافہ، تعلیم کے شعبہ میں وسعت، اندازِ فکر میں تبدیلی، سماجی قدروں میں سُدھار، آزاد ہندوستان کا عطیہ ہے۔ پریم چند کی تحریریں اپنے وقت کے تقاضوں کی آئینہ دار اور ایک فنکار کے دل کی دھڑکن ہیں۔ ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پریم چند کے ذہن کے ان دریچوں سے گذریں جن سے ہوکر مختلف افکار و نظریات نے ان کی تخلیقات کو جنم دیا ہے۔ اس پس منظر کا تجزیہ کریں جس کے پس پردہ اصل محرکات کروٹیں لیتے اور فکر و کاوش کا روپ اختیار کرکے ادب کے سانچوں میں ڈھلتے رہے۔ وہ حالات و حادثات جن سے پریم چند دوچار ہوئے جب اس فنکار کی گرفت میں آئے تو ادبی ملبوسات کا ایسا مظہر بنے کہ لاکھوں ذہنوں کے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوئے۔

پریم چند نے آنکھ کھولی تو ملک کو شدید بحران میں مبتلا پایا۔ نصف صدی میں ہی غیر ملکی تسلط نے جاگیردارانہ نظام کی جڑوں کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ زمیندار، جاگیردار، تعلقدار، نواب، راجہ، مہاراجہ درجہ بدرجہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے عام رعیت اور کسانوں کا مختلف جہتوں سے استحصال کر رہے تھے۔ سماج کا ہر شخص اپنے سے کمزور کو دبا رہا تھا۔ اس طرح ملک

غلام در غلام بنا ہوا تھا۔ انسانی برادری بے شمار درجات میں تقسیم ہو چکی تھی۔ باہمی یگانگت کے فقدان نے سماج کے آپسی رشتوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ غیر ملکی صنعت کاروں کی بدولت سارا ملک سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں آچکا تھا۔ یہ غیر ملکی حکمرانوں کی حکمت عملی تھی کہ ملک میں بہ یک وقت جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی بنیادوں کو اس طرح مضبوط کیا گیا کہ اس کا اقتصادی، سماجی اور اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ مساوات کا فقدان تھا۔ قومی وحدت و یگانگت ناپید تھی۔ مشترکہ تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ سارا ملک عدم استحکام کا شکار تھا۔ متوسط طبقہ کا وجود خطرے میں تھا۔ کمزور اور غریب اس حد تک ٹوٹ چکا تھا کہ اس میں فریاد کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بیکسی اور یاس کے اس ماحول نے کچھ ایسی غیر انسانی رسوم کو جنم دے دیا تھا کہ سماج کا ایک طبقہ خصوصاً اور ہر طبقہ کے کچھ افراد عموماً جانوروں سے بھی بدتر زندگی گذارنے کے لیے مجبور تھے۔ سالہا سال کے اس استحصال کے نتیجے میں پورا معاشرہ سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ ان حالات نے مفکرین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ملک کے مختلف گوشوں میں متعدد تحریکیں جنم لینے لگیں۔ اصلاح کے لیے کچھ نے مذہب کو اولیت دی، کچھ نے سماجی فلاح و بہبود کو مقدم جانا اور اس جانب متوجہ ہوئے۔ کچھ جیالے ایسے بھی اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے غیر ملکی تسلط کو ان حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ بہر حال نصب العین ایک تھا۔ رائیں مختلف تھیں۔ منزل ایک تھی، راستے جداگانہ تھے۔ پریم چند ان مختلف تحریکات، افکار و نظریات سے متاثر ہوئے۔

پریم چند سے پہلے ملک گیر سطح پر بعض تحریکیں مذہبی اور سماجی اصلاح کی غرض سے وجود میں آچکی تھیں۔ پریم چند ذہنی طور پر ان تحریکوں سے متعلق بعض شخصیتوں کے زیر اثر تھے۔ اسی سبب ہمارے لیے ان تحریکوں اور شخصیتوں

کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ سب سے پہلا اور بہت اہم نام راجہ رام موہن رائے کا ہے۔ منوہر لال زتشی کے مطابق :

" جنگ پلاسی کے سترہ برس بعد ۱۷۷۴ء میں بنگال کے ضلع ہگلی کے قصبہ رادھا نگر میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے باوجود عظیم دقتوں کے اپنے گرد و پیش کی مشکلات پر فتح حاصل کر کے ہندوستان میں مذہبی، سوشل اور قومی اصلاح کی بنیاد رکھی جس نے مذہب کے میدان میں بت پرستی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی طرف اپنی قوم کو متوجہ کیا۔ ستی کی قبیح رسم کی بیخ کنی کر کے سوشل اصلاح کے پہلے مرحلے کو طے کیا اور انگلستان میں پارلیمنٹ کی کمیٹی کے سامنے اظہار دے کر اُن پولیٹکل اصول کا خاکہ کھینچا جس میں آج تک رنگ و روغن بھرا جا رہا ہے۔"[1]

راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی مذہبی اور سماجی اصلاح کی غرض سے بنگال میں "برہمو سبھا" کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی سبھا نے کچھ عرصہ بعد "برہمو سماج" کے نام سے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور جلد ہی ملک کے ایک بڑے حصہ میں پھیل گئی :

" انھوں نے ..... ایک انجمن ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء کو برہمہ سبھا کے نام سے قائم کی ..... چیت پور روڈ پر زمین خرید کر برہمو سماج کے لیے عمارت تعمیر کی گئی۔ ۲۳ جنوری ۱۸۳۰ء کو یہ عمارت بن کر تیار ہوگئی اور اسی روز اس میں برہمو سماج منتقل کر دی گئی۔"[2]

اس تحریک نے قدامت پرستی اور تنگ نظری پر مبنی بعض فرسودہ رسوم کے خلاف مورچہ قائم کیا، خدائے واحد کی طرف ہندو قوم کو رغبت دلائی، عورتوں کی زبوں حالی پر توجہ دی ستی کی وحشیانہ رسم کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا

---

[1] راجہ رام موہن رائے، منوہر لال زتشی، ماہنامہ ادیب، جولائی ۱۹۱۱ء ص ۲۹۔

[2] ایضاً ص ۳۹۔

اور بالآخر ۴ ردسمبر ۱۸۲۹ء کو حکومتِ وقت نے اسے خلافِ قانون قرار دیا۔ راجہ رام موہن رائے کا یہ کارنامہ بلاشبہ ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے لیکن ان کا تاریخی اہمیت کا حامل ایک کام اور بھی ہے۔ اس زمانے کے بعض ہندو مرد ایک سے زائد شادیاں کرتے۔ نتیجہ میں وہ اپنے مرنے کے بعد کئی عورتوں کو بیوہ چھوڑ جاتے۔ ہندو سماج میں بیواؤں کے لیے دوسری شادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انھیں منحوس خیال کیا جاتا۔ خوشی کے موقعوں پر ان کا دیکھ لیا جانا یا ان سے ملنا بدشگونی کی علامت سمجھی جاتی۔ راجہ رام نے عورتوں کے ساتھ جاری اس غیر انسانی سلوک کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے کئی کم سن بیواؤں کی شادیاں کرائیں اور اس بات کی کوشش کی کہ شوہروں کی جائداد سے عورت کو بھی حصہ ملے۔ پریم چند نے سب سے پہلے اس جانب توجہ دی اور اسے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ بقول ڈاکٹر نریش :

> "پتی کو پرمیشور کا درجہ دے کر ہندو سماج نے جس عورت کو گھر کی داسی اور مرد کے بستر کی زینت بنا دیا تھا اور جس عورت کو ہندو سماج نے پتی کے ساتھ ستی ہونے پر مجبور کر رکھا تھا، پریم چند نے اسی عورت کے لیے پتی کی موت کے بعد زندگی کا حق مانگا۔" [۱]

انھوں نے "آہ بیکس"، "بیٹی کا دھن"، "نوک جھونک"، "معصوم بچہ"، "ابھاگن"، "بدنصیب ماں" وغیرہ اپنے افسانوں اور "ہم خرما وہم ثواب"، "روٹھی رانی"، "جلوۂ ایثار"، "بیوہ"، "نرملا"، "غبن" وغیرہ ناولوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہندوؤں میں کثرتِ ازدواج اور بیواؤں کے ان ہی مسائل کی جانب پڑھنے والوں کی توجہ دلائی ہے۔ وہ اپنے ناول 'بیوہ' میں کملا پرشاد کی زبانی کہتے ہیں :

---

[۱] پریم چند اردو ناول میں ادب برائے زندگی کے محرک، ڈاکٹر نریش۔ ماہنامہ پروازِ ادب، نومبر ۱۹۸۰ء، ص ۴۵۔

"اگر کسی ناگہانی صدمے سے یہ مکان گر پڑے تو ہم کل سے اسے پھر سے بنانا شروع کر دیں گے مگر جب کسی عورت کی زندگی پر کوئی ناگہانی آفت پڑ جاتی ہے تو اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس نام کو روتی رہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے"۔ [۱]

راجہ رام موہن رائے کی وفات [۲] کے بعد برہمو سماج تحریک کی قیادت رویندر ناتھ ٹیگور نے کی [۳]۔ بعد میں بعض جزوی اختلافات کی بنا پر تحریک دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ پہلے گروہ کی قیادت تو رویندر ناتھ ٹیگور ہی کے ہاتھوں ہی میں رہی لیکن دوسرا گروہ کیشب چندر سین کے زیرِ قیادت چلا گیا:

"۱۱ر نومبر ۱۸۶۶ء کو کیشب چندر سین نے مہارشی رویندر ناتھ ٹیگور سے الگ ہو کر برہمو سماج آف انڈیا قائم کی۔ اس نئی سماج کے قائم ہونے پر برہمو سماج کے پرانے ممبروں نے اپنی انجمن کا نام آدی برہمو سماج رکھ لیا"۔ [۴]

عبداللہ یوسف علی کے مطابق اس انجمن کے:

"کام کے پانچ حصے تھے یعنی طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود، تعلیم ارزاں قیمت پر، علمی کتابوں کی اشاعت، نشے کی چیزوں کو بند کرنے کی کوشش، خیرات کی تنظیم"۔ [۵]

---

[۱] بیوہ، پریم چند۔ ص ۱۳۵

[۲] ۲۷ر ستمبر ۱۸۳۳ء کو دماغی بخار کی وجہ سے برسٹل (انگلینڈ) میں وفات ہوئی۔ بھارت بھومی کا اتہاس شیو نرائن سنگھ رانا۔ ص ۳۴۴

[۳] اہل ہند کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر تارا چند۔ ص ۵۱۶

[۴] "کیشب چندر سین" منوہر لال زتشی۔ "ادیب" اکتوبر ۱۹۱۱ء ص ۱۸۶

[۵] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، عبداللہ یوسف علی۔ ص ۱۶۵

کیشپ چندر سین اور ان کے معاون گوبند رانا ڈے نے اپنے زورِ خطابت سے اس تحریک کو بہت قوت عطا کی۔ ملک کے دور دراز گوشوں میں پہنچ کر انھوں نے ذات پات کے خلاف آواز بلند کی۔ مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں کو جایز قرار دیا۔ تعلیم کی اہمیت پر خاصا زور دیا۔ عام بچّوں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے بالترتیب جگہ جگہ مدرسے، یتیم خانے اور بیوہ آشرم قائم کیے اور ان کے لیے ہر ممکن سہولتیں فراہم کیں۔ کم عمر بچّوں کی شادی کی مخالفت کی اور بیوہ کی دوسری شادی پر زور دیا۔ مشترکہ خاندان میں عورت کے لیے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا اور ان سے نجات پانے کے ذرائع بتائے۔ اسی نظریے سے متاثر ہو کر سری نواس لاہوٹی پریم چند کے ذہنی ارتقاء کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ رواج :

”ہندوستان میں صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن اب یہ رواج زمانے کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا، اس لئے کہ جس عہد میں زمین ہی سب کچھ سمجھی جاتی تھی اور پیداوار کا خاص ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ اس عہد میں مشترکہ خاندان کا تصور بالکل درست ہو سکتا تھا لیکن جس عہد میں تمام لوگوں کے روزگار مختلف ہوں اور کوئی کم اور کوئی زیادہ کماتا ہو، اس رواج کی کامیابی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔“[1]

پریم چند نے ان تمام نکات کی تشریح کو اپنا نصب العین بنایا اور مختلف انداز سے ان کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ ”غبن“ میں رتن کہتی ہے :

”میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز پر میرا دعویٰ نہیں۔ میں کرایہ کی لونڈی تھی۔ لونڈی کا گھر سے کیا تعلق، نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا ...... اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچ سکتی تو میں اپنی بہنوں سے کہتی کسی مشترکہ خاندان میں شادی

---

[1] پریم چند کا ذہنی ارتقاء، سری نواس لاہوٹی۔ شاعر، بمبئی، جون ۱۹۷۱ء۔ ص ۱۸

مت کرنا اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنا لینا آرام کی نیند نہ سونا۔“ [1]

”برہمو سماج“ کے بعد ایک دوسری تحریک، آریہ سماج نے ملک گیر اثرات مرتب کیے۔ آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی[2] نے ۱۰ اپریل ۱۸۷۵ء کو بمبئی میں رکھی۔ رفتہ رفتہ دوسری جگہوں پر بھی اس تحریک کی شاخیں قائم ہوتی گئیں۔ اس تحریک نے بت پرستی کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔ جوالا پرشاد برقؔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ سوامی جی کی اس تحریک سے قبل:

”ہندو قوم بیہودہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی ـــــ بیچاری لڑکیوں کا قتل، بیواؤں پر ظلم، تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی عیاش پنڈتوں کو اپنی بیوی تک دان دینا مذہبی رسم و رواج میں داخل ہو گیا تھا۔“ [3]

مگر آریہ سماج تحریک نے:

”اچھوت اودھار و گئو رکشا پر زور دیا تھا۔ شُدھی کا راستہ دکھلایا تھا۔ بال بِدھواؤں کی شادی کی تلقین کی تھی اور یہ بتلایا تھا کہ ویدوں کے پڑھنے کا استحقاق ہر ایک انسان کو ہے۔“ [4]

ڈاکٹر صادق اس کی افادیت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ اس تحریک نے:

”ذات پات کے اختلافات ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے، اشاعتِ تعلیم،

---

[1] ”غبن“ پریم چند، ص ۳۰۰

[2] سوامی جی ۱۸۲۴ء میں کاٹھیاواڑ (گجرات) کے موروی نگر میں پیدا ہوئے اور ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ بھارت بھومی کا اتہاس، ص ۳۲۶ - ۳۲۷

[3] شری سوامی دیانند جی، جوالا پرشاد (زمانہ، فروری ۱۹۲۵ء) ص ۹۰

[4] ایضاً ص ۹۳

بالخصوص تعلیم نسواں کے لیے بھرپور کام کیا، مذہبی روپ دھارن کر لینے والے رسوم ورواج سے ہندو مذہب کا دامن پاک کرنے کی امکان بھر سعی کی اور اپنے پیرووں کو ویدوں کے سائے میں آنے کی دعوت دی۔" [1]

پریم چند سوامی جی کی عہد آفریں شخصیت اور ان کی تحریک کی افادیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے تنگ نظری اور فرسودہ رسوم پر اپنے ڈرامہ "روحانی شادی" میں سخت نکتہ چینی کی ہے۔ اس ڈرامہ کے آخری منظر میں ہیروئن مس جنی کہتی ہے:

"میں نے ایک قابلِ قدر ہستی کو رسوم پر قربان کیا اور آج ان رسوم کو اس کے نام پر قربان کردوں گی ـــــ ہمارے رسوم کتنے مہلک ہیں ـــــ جسے ہم مذہب کہتے ہیں محض رسوم کا پھندا ہے۔ ہماری روح اور ضمیر کی آزادی اس پھندے میں تڑپتی ہے ـــــ میں آج بلند آواز سے کہتی ہوں کہ انسان عقائد سے زیادہ اہم اور کہیں زیادہ بیش بہا ہے۔"

ابتداءً آریہ سماج کا مقصد مذہبی تعلیم کی ترویج تک محدود تھا پھر قوم کے مفاد میں اس کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ آریہ سماجی تحریک سے پریم چند کو جو روحانی لگاؤ تھا اس کا اظہار ان کے ناول "ہم خرما و ہم ثواب" میں ہوتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایک نوجوان وکیل امرت رائے ہے۔ وہ سناتن دھرم چھوڑ کر آریہ سماجی عقائد اپنا لیتا ہے اور بڑی شدومد کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔ دھرم کے مروجہ معمولات سے انحراف کے سبب اس کی شادی پریما سے نہیں ہو پاتی ہے۔ لالہ بدری پرشاد اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا ہونے والا داماد 'ادھرمی' ہوکر

---

[1] ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، ڈاکٹر صادق، ص ۱۰-۱۱

روایات پر نکتہ چینی کرے اور قدیم ہندو تہذیب کی بے حرمتی کا مرتکب ہو۔ امرت رائے محبت کے جذبہ کو قوم کی خدمت کے فرض پر قربان کرتے ہوئے لالہ بدری پرشاد کو لکھتا ہے کہ :

"ہماری طرزِ معاشرت احکامِ وید سے متناقص ہے اور جس کو غلطی سے سناتن دھرم کہتے ہیں وہ ان پرانے بوسیدہ خیال لوگوں کی جماعت ہے جو مذہب کے پردے میں ذاتی فلاح ڈھونڈھتے ہیں۔ اس لیے ہم کو مجبوراً اس سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ اگر اس حیثیت میں آپ مجھ کو فرزندی میں قبول فرمائیں تو خیر، ورنہ مجھے اپنی بدقسمتی پر بھی افسوس نہ ہوگا۔" [۱]

پریم چند نے اس ناول میں توہم پرستی، اندھی تقلید اور فرسودہ رسموں کے خلاف آواز بلند کی ہے اور بیوہ کی شادی اور مختلف ذاتوں کے مابین رشتے قائم کرنے کی تحریک کی ہے۔ بقول ڈاکٹر نریش :

"آریہ سماج کی جس تحریک نے بیوہ کی شادی کے مسئلے کو لے کر ہمارے سماجی شعور کو جھنجھوڑنا شروع کیا تھا اسے پریم چند نے اپنے اوّلین ناولوں میں ہی یہ صورت عطا کر دی کہ ان کا کردار امرت رائے بیواؤں کے لیے آشرم قائم کرکے انھیں ہندو سماج کے مظالم سے محفوظ کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو اٹھتا ہے۔" [۲]

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی خود بھی برہمو سماج تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسی سبب دونوں تحریکوں میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے اور بادی النظر میں کوئی بڑا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ برہمو سماج نے ہندوؤں کے اندر پھیلی ہوئی سماجی برائیوں کو دور کرنے پر زور دیا اور

---

[۱] "ہم خرما و ہم ثواب"، پریم چند، ص ۲۳

[۲] پریم چند اردو ناول میں ادب برائے زندگی کے محرک۔ ص ۴۴

آریہ سماج نے ان کے عقائد کی اصلاح کو غرض و غایت بنالیا۔ اس طرح نصب العین کے اشتراک کے ساتھ ان دونوں تحریکوں نے ہندو سماج میں پھیلی ہوئی مختلف قسم کی برائیوں اور خراب رسموں کو دور کرنے کی جدو جُہد کی۔ مقصد کے اس اتحاد کے باوجود دونوں تحریکوں میں جزوی طور پر نقطۂ نظر اور طریقۂ کار میں اختلاف بھی رہا ہے:

"سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج صرف ویدوں کو الہامی کتب مانتے ہیں اور دیگر مذاہب کی بڑی شدّومد سے تردید کرتے ہیں .....
راجہ رام موہن رائے نے خدا کو خلاق مانا ہے اور ان کو کسی مذہب کی خوبیوں کے اخذ کرنے میں ذرا بھی دریغ نہیں ہے۔ ان کی نظر میں جیسی ویدوں کی عظمت ہے اسی طرح قرآن اور انجیل کی بھی ہے۔" [۱]

دونوں تحریکوں نے ہندو قوم کی تعمیر انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بنیاد پر، جدید تقاضوں کے مطابق کرنی چاہی۔ ذات پات کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی تعلیمی اہمیت پر زور دیا۔ علم کی اہمیت پر دونوں تحریکوں میں یکساں زور دیا جاتا تھا۔ دونوں کے حامیوں نے متعدد مقامات پر اسکول اور کالج کھولے۔ ویدک علوم کو جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق پیش کیا۔ برہمو سماج اور آریہ سماج تحریکوں کے علاوہ پریم چند ایک تیسری تحریک "راماکرشنا" کے بھی بڑے مداح تھے جو اس زمانہ میں ملک گیر حیثیت حاصل کر رہی تھی۔ راماکرشنا مشن کی بنیاد بنگال کے ایک برہمن جوگی شری رام کرشن پرم ہنس نے رکھی تھی۔ یہ تحریک جوگی جی کے نام کی مناسبت سے مشہور ہوئی:

"سری راماکرشنا بنگال کے ہگلی ضلع کے ایک گاؤں کمار پکور میں ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خودی رام گاؤں کے مندر کے پجاری تھے۔

---

[۱] "راجہ رام موہن رائے" دیا نرائن نگم، زمانہ، ستمبر ۱۹۰۵ء، ص ۱۳۲

۱۸۵۵ء میں جب کہ سری راما کرشنا کی عمر تقریباً انیس سال کی تھی، وہ دکسنیشور کے مندر پہنچے ــــ پہلے تو اس مندر میں اپنے بھائی کے نائب کے طور سے کالی دیوی کے پجاری مقرر ہوئے اور پھر بھائی کے انتقال کے بعد اس جگہ پر مکمل پجاری کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔" [۱]

رام کرشن پرم ہنس مورتی پوجا کے قائل اور کالی ماں کے بھگت تھے۔ ان کی شخصیت اور افکار نے اس زمانے میں خاصے بڑے تعلیم یافتہ حلقہ کو اپنے زیرِ اثر لے لیا۔ ان کے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھتی گئی اور جوگی جی کے افکار و نظریات سے لوگ مستفیض ہوتے رہے۔ کالی ماں کے ساتھ خصوصی عقیدت کے باوجود تمام مذاہب کا احترام ان کے مشن میں شامل تھا۔ بنکم چندر چٹرجی اور گریش چندر گھوش جیسے ادیب اس مشن کے ہمنوا ہوئے لیکن سب سے ممتاز نام سوامی وِویکانند [۲] کا ہے جو بڑے پایے کے خطیب، مفکر اور اپنے مخصوص مذہبی معاملات کے زبردست عالم [۳] تھے۔ انھوں نے اپنے زورِ بیان اور زور استدلال سے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ ان کے کارناموں سے پریم چند بھی نہایت متاثر تھے چنانچہ وہ ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ماہنامہ "زمانہ" کے شمارہ مئی ۱۹۰۸ء میں "سوامی وویکانند" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

---

[۱] عشق اور بھگتی، عماد الحسن آزاد فاروقی، ص ۷۷، تا ۸۰

[۲] ۱۲ جنوری ۱۸۶۳ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں ان کی ملاقات رام کرشن پرم ہنس سے ہوئی اور ۴ جولائی ۱۹۰۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

بھارت بھومی کا اتہاس، شیو نرائن سنگھ رانا، ص ۳۲۹-۳۳۰

[۳] وویکانند کا خیال تھا کہ ہندوستان میں ایک مضبوط اور دائمی قومیت کی تعمیر مذہبی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فرقہ پرست یا متعصب تھے۔ ان کی نظر میں مذہب روحانی اور اخلاقی ارتقاء کے داخلی اصولوں کا اشاریہ ہے۔ ماڈرن انڈین پولیٹیکل تھاٹ، ڈاکٹر وشوناتھ پرساد ورما۔ ص ۱۰۴۔

"گذشتہ صدی عیسوی کے ابتدا میں مادیت نے سر اٹھایا۔ اس کا حملہ ایسا پرزور تھا کہ ہندوستان کی روحانیت کو اس کے مقابل میں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا ــــ ایسی حالت میں ہندوستان کی خاک پاک سے پھر ایک بزرگ اٹھا جو روحانیت کے جوش سے معمور تھا۔ جس کا دل محبت سے لبریز تھا ــــ یہ اس نفس پاک کی تعلیم کی برکت ہے کہ آج ہم اپنے قدیم معیاروں کی پرستش کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

پریم چند سوامی وویکانند کی بارعب اور پروقار شخصیت کی "دلنشین تصویر" "جلوۂ ایثار" میں پیش کرتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو سوامی جی کی طرح "ذہین اور متین معصوم اور خوبصورت"[1] ہے:

"سوامی جی نہایت وجیہہ و شکیل بزرگ تھے۔ آپ کی نگاہ میں برقی تاثیر تھی۔ چہرہ روحانیت کے رعب و جلال سے منور تھا۔ مزاج بہت سادہ اور روش بالکل منکسرانہ تھی۔ ان کی علمیت لامحدود تھی۔"[2]

سوامی جی نے اپنے گرو کی تعلیمات کو پھیلانے کے خاطر دور دراز علاقوں کے علاوہ غیر ممالک کے بھی سفر کیے۔ ان کی تعلیمات کے زیر اثر پریم چند مذکورہ مضمون میں ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"سری سوامی وویکانند کی تعلیم روحانیت کی کرامات ہے ــــ سوامی جی کی تلقینات کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں، روحانیت حاصل کریں۔ شہ زور اور دلاور ہوں۔ نیچی ذاتوں کو ابھاریں اور انھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ ہندو فلسفہ کے عملی پہلو پر عمل کریں اور نفس کشی اور ریاضت اور ترک ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنھیں ایشور نے ان بلندیوں تک پہنچنے کی توفیق دی ہے۔"

---

[1] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر قمر رئیس۔ ص ۲۰۳

[2] بحوالہ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ص ۲۱۲۔ ۲۱۳

ہندوستان کی قومی اور سماجی تعمیر میں بعض غیر ملکی اداروں اور افراد کی کاوشیں بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے ملک کو مغرب کے نئے رجحانات سے آگاہ کرایا اور ذی شعور حضرات کو مشعلِ راہ دکھائی۔ ان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس سوسائٹی کا وجود بمقام نیویارک (امریکہ) بتاریخ ۷ دسمبر ۱۸۷۵ء عمل میں آیا تھا۔ اس کی شاخ ۱۸۸۲ء میں کرنل اسکاٹ اور میڈم بلاواٹسکی نے مدراس میں قائم کی تھی لیکن گیارہ سال بعد ۱۸۹۳ء میں محترمہ اینی بیسنٹ نے ہندوستان آکر اس کی ذمہ داریاں سنبھالیں[1] اور اس کو فعال بنایا۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے زیر اہتمام بنارس میں سنٹرل ہندو اسکول کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی سرگرمی میں ترقی کرکے ہندو یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔ اس سوسائٹی کے کچھ اصول تھے جن کے دائرے میں رہ کر انھوں نے اپنے کام کو آگے بڑھایا۔ اس کے اراکین نے بھی اپنے افکار و نظریات اور کارکردگی سے بہت سے لوگوں کے دلوں کو متاثر کیا۔ سماجی اصلاح کے جتن کیے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے کوششیں کیں۔ پریم چند کو بھی ہندوستانیوں میں تعلیم کی کمی کا شدید احساس تھا اور وہ بھی ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے انسانوں میں تعلیم کے رواج کو عام کرنا چاہتے تھے۔ "زادِراہ" "خاکِ پروانہ" اور "واردات" کے اکثر افسانوں میں انھوں نے تعلیم کی قدر و قیمت پر مختلف زاویوں سے زور دیا ہے۔ ناول گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کی اہمیت سے بحث کی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بہت سی سماجی برائیاں محض تعلیم کی کمی کی وجہ سے باقی ہیں۔ تعلیم عام ہوگی تو رفتہ رفتہ یہ برائیاں خود ہی ختم ہو جائیں گی۔ تعلیم کی طرف سے عوامی غفلت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنے ایک افسانہ "روشنی" میں کہا ہے:

---

[1] بھارت کا راشٹری آندولن ایوم سنودھانک وکاس، ڈاکٹر جی۔ ڈی۔ تیواری ص ۱۰۸

"یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔" [1]

"میدانِ عمل" میں تعلیم کے مقصد، اہمیت اور پھر اس کے فروغ کے سلسلہ میں بعض کاوشوں کا ذکر کرتے ہیں:

"یہ مدرسہ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے ہی میں تھا۔ نو بجے تک ڈاکٹر صاحب خود تعلیم دیتے تھے۔ اگرچہ یہاں فیس بالکل نہ لی جاتی تھی اور تعلیم کے جدید اور بہترین اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی پھر بھی لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی ـــ مشکل سے دو ڈھائی سو لڑکے آتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھولے بھالے معصوم بچوں کا فطری نشو و نما کیسے ہو۔ وہ کیسے باہمت، قناعت پسند، سچے خادم بن سکیں۔ یہی اس کا خاص مقصد تھا۔" [2]

مختلف تحریکوں کے زیرِ اثر تعلیم کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے رجحان اور اس کے مثبت اثرات کا بیان "میدانِ عمل" میں وہ اس طرح کرتے ہیں:

"تھوڑے سے دنوں میں ہی تعلیم کا کچھ کچھ اثر بھی نظر آنے لگا ہے، بچے اب صاف رہتے ہیں، جھوٹ کم بولتے ہیں، جھوٹے بہانے نہیں کرتے۔ گالیاں نہیں بکتے اور گھر سے کوئی چیز چرا کر نہیں لے جاتے، نہ اتنی ضد ہی کرتے ہیں۔ گھر کے معمولی کام شوق سے کرتے ہیں۔" [3]

مذکورہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ذریعہ وارانسی میں ایک بڑے تعلیمی مرکز کا

---

[1] "روشنی"۔ مجموعہ واردات۔ ص ۲۷

[2] میدانِ عمل۔ ص ۱۲۹

[3] میدانِ عمل۔ ص ۱۹۷

قیام عمل میں آیا تھا جو پریم چند کے نصب العین کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک جزُ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سوسائٹی نے عالمی برادری کا جو تصور اس زمانے کے سماج کو دیا تھا اس میں بھی پریم چند کے لیے بڑی جاذبیت تھی۔ خود ان کے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں کسی ایک ذات یا برادری تک محدود نہیں تھیں۔ وہ تمام انسانوں کے لیے سوچتے تھے۔ ان کے اندر کا فن کار عام انسانوں کی محرومی پر تڑپ اٹھتا اور فن کے روپ میں زندگی کی سچی عکاسی کرتا۔

ذات پات کی تفریق کے نتیجے میں اچھوتوں کو کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ اس تفریق کے انسداد کے لیے جدوجہد کرنا اس زمانے کی کم و بیش تمام اصلاحی تحریکوں کے لیے ایک مشترک مقصود بنا ہوا تھا۔ پریم چند نے بھی اس باب میں خصوصی توجہ کی۔ وہ اچھوتوں کے حالِ زار پر بے چین ہو اٹھتے۔ انھوں نے "اچھوت طبقہ کے وجود کو ہندو دھرم کے نام پر بڑا کلنک مانا ہے"۔ وہ "میدان عمل" میں اس مسئلہ کو بڑے تیکھے انداز سے پیش کرتے ہیں اور اس سے متعلق واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حساس ذہن میں چنگاریاں سی اٹھنے لگتی ہیں۔ ٹھاکر دوارہ میں ایک ماہ سے مدھوسودن جی کی کتھا ہو رہی ہے۔ اس کتھا کو سننے کے لیے اچھوت بھی پہنچتے ہیں اور مندر کے اس حصہ میں جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں جہاں جوتے چپل وغیرہ رکھے جاتے ہیں کسی طرح مندر کے اندر خبر ہو جاتی ہے کہ اچھوت دروازے کے پاس بیٹھے کتھا سن رہے ہیں۔ اس خبر سے مندر میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ برہمچاری جی نے :

> "اپنا سر پیٹ لیا، یہ بدمعاش روز یہاں آتے تھے اور سب کو چھوتے تھے۔ ان کا چھوا ہوا پرشاد روز لوگ کھاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر اندھیر اور کیا ہو سکتا ہے"۔[1]

---

[1] میدان عمل۔ ص ۲۳۴

دھرم کے بھرشٹ ہو جانے کی وجہ سے :

"دین داروں کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ کئی آدمی جوتے لے کر ان غریبوں پر پل پڑے۔ بھگوان کے مندر میں بھگوان کے بھگتوں کے ہاتھوں بھگوان کے بھگتوں پر جوتوں کی بارش ہونے لگی۔" [۱]

پریم چند اس ظلم کے خلاف اپنے خیالات کو ڈاکٹر شانتی کمار کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لیے۔ لگائیے خوب کس کس کر اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ بندوقیں منگائیے اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کر دیجئے۔ اور تم دھرم کو ناپاک کرنے والو تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھا سکو، کھاؤ۔ تمھیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ، مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں ـــــ یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں۔ موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔" [۲]

اچھوت ہر ظلم و ستم برداشت کرتے پھر بھی برہمنوں کو مقدس جان کر قابل پرستش سمجھتے۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کے وسیلے کو ضروری خیال کرتے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس :

"یہ لوگ انھیں ہمیشہ سے ہندو دھرم کا محافظ سمجھتے آئے ہیں اس لیے وہ ان کی عزت کرتے اور ان کی بزرگی اور جلال سے خوفزدہ رہتے۔ انھیں خوش کر کے اور دان دچھنا دے کر وہ سمجھتے کہ دیوتاؤں کو منا لیا۔" [۳]

صدہا صدیوں کی وراثت میں ان کا ذہن اس طرح ہموار ہوا کہ برہمنوں کو ہر طرح

---

[۱] میدان عمل۔ ص ۲۳۵

[۲] میدان عمل۔ ص ۲۳۶

[۳] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ص ۴۲۵

خوش رکھنا ہی ان کے لیے مذہب کا بنیادی فریضہ ہوگیا۔ پریم چند نے برہمنوں کی روش اور ان کے طور طریق کو گئو دان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بہت سی ڈھکی چھپی گرہیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور ڈاکٹر قمر رئیس کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ :

"برہمنوں نے مذہب کو ہمیشہ اپنے خود غرضانہ مفاد کے لیے استعمال کیا ہے[۱]"

ہر بجن عورت کے ساتھ مذہبی رعب جما کر جنسی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کو پریم چند "گئو دان" میں یوں اجاگر کرتے ہیں :

"آج تو تم یہاں سے نہ جانے پاؤگی جھونا رانی ! روج روج کلیجے پر چھری چلا کر بھاگ جاتی ہو۔ آج میرے ہاتھ سے نہ بچوگی ـــــ ایک چاہنے والے کا من رکھ لوگی تو تمھارا کیا بگڑے گا جھونا رانی ! کبھی کبھی گریبوں پر دیا کیا کرو، نہیں بھگوان پوچھیں گے کہ میں نے تمھیں اتنا روپ کا دھن دیا تھا، تم نے اس سے ایک برہمن کا اپکار بھی نہیں کیا تو کیا جواب دوگی ؟ بولو ! روپئے پیسے کا دان تو سدا ہی پاتا ہوں، آج روپ کا دان دو[۲]"

اچھوتوں کے ساتھ جابر سلوک کے نتیجے میں جن پیش آنے والے حالات کی بظاہر اس عہد میں کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی پریم چند ان خطرات کو بخوبی بھانپ لیتے ہیں اور ان کا قلم اس جانب واضح نشاندہی کرتا ہے۔ چھوت چھات کی لعنت جس تباہ کن معاشرے کی تخلیق کرسکتی ہے پریم چند اس سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں ۔ وہ اپنی تحریروں سے پورے معاشرے کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اچھوتوں کے ردّ عمل کی شدّت کو انھوں نے "گئو دان" میں بہت اچھے روپ سے پیش کیا ہے ۔ پنڈت ماتا دین نے سلیا چمارن کو شادی کے وعدے پر اپنے گھر میں رکھ کر اس کے روبرو "جنیئو" ہاتھ میں لے کر کہا تھا سلیا ! جب تک

۱؎ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ۔ ص ۴۲۵

۲؎ گئو دان ۔ ص ۷۷ ۔ ۷۸

دم میں دم ہے تجھے بیاہتا کی طرح رکھوں گا'' مگر اس کا یہ وعدہ ایک سراب تھا:

"سلیا کا سب کچھ لے کر بھی وہ بدلے میں کچھ نہ دینا چاہتا تھا۔ سلیا اب اس کی نگاہ میں صرف کام کرنے کی مشین تھی اور بس۔ اس کی محبت کو وہ بڑی چالاکی سے نچاتا رہتا تھا۔'' [۱]

تنگ آ کر سلیا کے باپ ہرکھو نے ایک موقع پر معاملہ کو اس طرح اٹھایا:

"ہم آج یا تو ماتا دین کو چمار بنا کر چھوڑیں گے یا ان کا اور اپنا رکت ایک کر دیں گے — تم ہمیں بامھن نہیں بنا سکتے مُدا ہم تمھیں چمار بنا سکتے ہیں۔ ہمیں بامھن بنا دو، ہماری برادری بننے کو تیار ہے۔ جب یہ سامرتھ نہیں تو تم بھی چمار بنو، ہمارے ساتھ کھاؤ پیو، ہمارے ساتھ اٹھو بیٹھو۔ ہماری اجت لیتے ہو تو اپنا دھرم ہمیں دو۔'' [۲]

ہرکھو کی اس دلیری اور صاف گوئی پر پنڈت ماتا دین کا باپ پنڈت داتا دین برہم ہو کر جواب دیتا ہے:

"ہرکھوا! تیری لڑکی وہ کھڑی ہے، لے جا، جہاں چاہے۔ ہم نے اسے باندھ نہیں رکھا ہے۔ کام کرتی تھی مجوری لیتی تھی۔ یہاں مجوروں کی کمی نہیں ہے۔'' [۳]

داتا دین کی بات سن کر سلیا کی ماں بے قابو ہو اٹھتی ہے اور غضبناک انداز میں کہتی ہے:

"واہ واہ پنڈت، اچھا نیاؤ کرتے ہو۔ تمھاری لڑکی کسی چمار کے ساتھ نکل گئی ہوتی اور تم اس طرح کی باتیں کرتے تو دیکھتی۔ ہم چمار ہیں اس لیے ہماری کوئی اجت نہیں! ہم سلیا کو اکیلی نہ لے جائیں گے، اس کے ساتھ ماتا دین کو بھی لے جائیں گے جس نے اس کی اجت بگاڑی ہے۔'' [۴]

معاملہ کی نزاکت، انتقام کی سلگتی ہوئی آگ اور ہرکھو کی للکار سن کر چماروں کی

---

[۱] گئودان۔ ص ۴۰۷۔ [۲] ایضاً ص ۴۰۹۔۴۱۰۔ [۳] اور [۴] ایضاً ص ۴۱۰۔

غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ پنڈت ماتا دین پر یلغار کر دیتے ہیں :

" دو چماروں نے لپک کر ماتا دین کے ہاتھ پکڑے اور تیسرے نے جھپٹ کر اس کا جنیؤ توڑ ڈالا اور اس کے قبل کہ داتا دین اور جھنگری سنگھ اپنی اپنی لاٹھیاں سنبھال سکیں دو چماروں نے ماتا دین کے منہ میں ایک بڑی ہڈی کا ٹکڑا ڈال دیا ___ اس ہڈی کے ٹکڑے نے صرف اس کے منہ کو ہی نہیں بلکہ اس کی روح کو بھی ناپاک کر دیا ___ اب وہ لاکھ پراشچت کرے، لاکھ گوبر کھائے اور گنگا جل پیئے، لاکھ دان پُن اور تیرتھ برت کرے، اس کا مرا ہوا دھرم جی نہیں سکتا ___ آج سے وہ اپنے ہی گھر میں اچھوت سمجھا جائے گا۔ اس کی ماتا بھری ماں بھی اس سے گھن کرے گی۔"[1]

(۲)

پریم چند کا عہد اپنے ماضی سے قدرے مختلف تھا۔ رام لال نابھوی کے الفاظ میں :

" یہ وہ زمانہ تھا کہ جہاں ایک طرف سماجی گھٹن، سیاسی اضطراب اور اقتصادی بدحالی پورے زوروں پر تھی وہاں ہندوستان میں قومی بیداری کی لہر اٹھ رہی تھی۔ فکر اور شعور کی رو داخل ہو رہی تھی۔"[2]

ذہنی بیداری کی وہ خفیف لہر جو مستقبل میں بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بننے والی تھی، وجود میں آکر سرگرم عمل ہو چلی تھی گو کہ عوام کی اکثریت شکست خوردگی کا شکار تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کی بے شمار یادیں بہت سے زخموں کو تازہ کیے ہوئے تھیں۔ غیر ملکیوں نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے جو اطوار اپنائے تھے ان کے اثرات پورے ملک پر خصوصاً عام

---

[1] گئو دان۔ ص ۴۱۰۔ ۴۱۲۔

[2] منشی پریم چند نئے اردو افسانے کے بانی۔ پرواز ادب، نومبر ۱۹۸۰ء ص ۶۶

رعایا پر مرتب تھے۔ حکومت کی اقتصادی اور معاشی پالیسی کے نتیجے میں عام بےچینی اور بیزاری پیدا ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد غیر ممالک سے واپس آتے، اپنے مشاہدات و تاثرات کسے برادرانِ وطن کو متعارف کراتے۔ اس پس منظر میں سماجی اور مذہبی تحریکوں نے ایک عام سیاسی بیداری کی فضا پیدا کر رکھی تھی جس کے نتیجہ میں بعض باشعور سرکاری ملازمین بھی اپنی ملازمتوں سے مستعفی ہونے لگے تھے۔ خود پریم چند نے ۱۵ / فروری ۱۹۲۱ء کو سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ گاندھی جی کی اس عدم تعاون کی تحریک کو پریم چند نے اپنے افسانہ "لال فیتہ" میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو جنگ آزادی کی حمایت اور اس میں شرکت پر آمادہ کرتا ہے۔ "لال فیتہ" کا ہیرو ہری بلاس جو ایک انصاف پسند ڈپٹی مجسٹریٹ ہے، اسے پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں، انگریزوں کے ساتھ پوری وفاداری کا ثبوت دینے کے صلے میں رائے بہادری کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے اور ساتھ ہی ایک سرکاری مراسلہ بھی دیا جاتا ہے جو سُرخ فیتے میں بندھا ہوتا ہے۔ مراسلے کو پڑھتے ہی ہری بلاس کے جذبات میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے میں حب الوطنی کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور وہ اپنے ذاتی مفادات کو ترک کرتے ہوئے سرکار کو جواب لکھتا ہے:

"میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا۔ ممکن ہے حکام بعض موقعوں پر مجھ سے خوش نہ رہے ہوں اس لیے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہ سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقص ہوا، میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمت ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ ـــــ میں جو احکام

نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کو اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تکمیل کے لیے ـــــ آمادہ نہیں کرسکتا ـــــ لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلاتاخیر اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے[1]۔"

انیسویں صدی کے آخری ایام میں مختلف اصلاحی تحریکوں کا زور تھا۔ مذہبی، سماجی اور معاشرتی تنظیموں نے:

"اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے ـــــ ایک سیاسی اور قومی تحریک کی شکل اختیار کرلی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے اِن تحریکوں میں اور زیادہ شدّت پیدا ہوگئی۔ سیاسی رہنما اس جدوجہد میں مصروف تھے ـــــ اور ادیب ـــــ ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے ـــــ چنانچہ پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ماضی کی عظمت اور اس کی روحانی صفات کی محبت پیدا کی اور وطن پرستی کا سبق سکھایا[2]۔"

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی ملک کی آزادی کے نغمے گائے اور اپنے پہلے مجموعۂ "سوزِ وطن" کے دیباچہ میں کہا:

"ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نشہ جمائیں۔"

انھوں نے ادب کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

"جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی سکون نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم

---

[1] "لال فیتہ" ماہنامہ زمانہ، جولائی ۱۹۲۱ء، ص ۳۷۔

[2] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۵۶۵ - ۵۶۶

میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے،
وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔"[1]

پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوم کو واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی ہوئی صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اپنی دھرتی سے قلبی لگاؤ، آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کا اظہار، پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریریں سے بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے رسالہ "ہنس" ۱۹۳۰ء کے ایک شمارہ میں نوجوانوں کو بڑے ولولہ انگیز انداز میں جنگ آزادی کے لیے اکساتے ہیں:

"تمھاری آنکھوں کے سامنے دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں ہوگئیں، تم نہیں جانتے؛ روس کی زار شاہی مٹ گئی۔ ایران کی کج کلاہی مٹ گئی۔ ترکی کی شہنشاہی مٹ گئی، چین کی خاقانی مٹ گئی۔ جرمنی کی قیصر شاہی مٹ گئی۔ یہاں تک کہ اسپین نے بھی آزادی کی سانس لی، مگر بھارت کہاں ہے؛ وہیں جہاں تھا۔ دین، دُکھی، دریدر۔ کیا تم جوان ہو کر بھی اسی بوڑھی، کھوسٹ، شرمناک، بزدلی سے بھری ہوئی، خوشامد میں ڈوبی ہوئی نیت کا پالن کروگے؛ کبھی نہیں، تم نئے یُگ کے نام لیوا ہو، تم جوان ہو۔ ابھی نیچ سوارتھ نے تمھیں اپنے رنگ میں نہیں رنگا۔ ابھی تمھاری کمر نے جھکنا نہیں سیکھا۔ تمھارے سر نے سجدہ کرنا نہیں سیکھا۔ تم میں جوش ہے۔ ہمیں تم سے امید ہے۔"[2]

۸/ مارچ ۱۹۳۲ء کے "چنگاری" میں پریم چند نے ہولی کے موقع پر ایک مضمون لکھا اور اس میں انھوں نے غلامی کی لعنت کو جلا کر خاک کر دینے کی تلقین کی:

---

[1] "روشنائی" سید سجاد ظہیر۔ ص ۱۱۸۔ ۱۱۹

[2] بحوالہ "کہانی کار" پریم چند نمبر، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۵۲ (ہندی)

"ہولی پھر آگئی حالانکہ بھارت کی ہولی تو انگلینڈ بہت پہلے ہی سے جلا چکا ہے اور اس سے سارا بھارت جلا کر خاک کر دیا ہے پھر بھی مردے بھارت واسی ہر سال کسی نہ کسی طرح ہولی مناتے ہی ہیں۔ پر اس سال کی ہولی اور سب ہولیوں سے نرالی ہے اور ہونی چاہیے.... اس سال ہم لوگ اپنے گھر کی ایک ایک چیز جلائیں گے۔ انگریزی مال خریدنے کا شوق جلائیں گے اور ان سب کے ساتھ ہی اپنی سیکڑوں سالوں کی غلامی جلائیں گے ـــــ جس نظامِ حکومت نے سارے بھارت میں مفلسی کی ہولی جلائی ہے، اس سال اُس نظامِ حکومت کی ہی ہولی جلائیں گے تبھی ہماری ہولی سچی ہولی ہوگی۔"

پریم چند کے دلی جذبات اور آزادی کے لیے ان کی تڑپ کا اندازہ اس خط سے بھی ہو جاتا ہے جو انھوں نے ۳ جون ۱۹۳۲ء کو ہندی کے مشہور صحافی اور ادیب بنارسی داس چترویدی کے نام لکھا:

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگِ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں ـــــ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں لکھوں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہے۔ میں آرام سے بیٹھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں ادب اور آزادیٔ وطن کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں[1]۔"

جنگ پلاسی[2] اور بکسر[3] کی لڑائی کے بعد ٹیپو سلطان کی شہادت[4] نے

---

[1] پریم چند، پرکاش چندر گپت، مترجم ل۔ احمد اکبر آبادی، ص ۱۱۰

[2] ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کے دن پلاسی کے میدان میں رابرٹ کلائیو کے زیرِ قیادت برطانوی فوجوں نے نواب سراج الدولہ، صوبہ دار بنگال کی فوجوں کو شکست دی۔

[3] ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم نے مل کر انگریزوں سے جنگ کی۔

[4] ۱۷۹۹ء میں لارڈ ولزلی نے ٹیپو سلطان کو شہید کر کے میسور کی سلطنت ختم کر دی۔

مسلم حکمرانوں کے اقتدار کا درپردہ فیصلہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ جو صدیوں حاکم رہے ان کی حیثیت میں فرق آچلا تھا۔ مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی اور انحطاط پذیر صورت اور غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی قوت نے بہت سے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس پس منظر میں متعدد تحریکیں وجود میں آکر سرگرم عمل ہو چکی تھیں جن کا سلسلہ ہم شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید وغیرہ کی تنظیموں سے جوڑ سکتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی "خدنگِ غدر" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

> "۱۷۷۶ء میں مجنوں شاہ نے نیپال کی ترائی سے ایک فقیری تحریک شروع کی جس کا مقصد بنگال میں انگریزوں کے کارخانوں اور اسلحہ کو تباہ کرنا تھا ــــ اس طرح کی ایک تحریک کرم شاہ (متوفی ۱۸۰۳ء) نے شروع کی جو پاگل پنتھی کے نام سے مشہور ہے[1]۔"

اس کے علاوہ حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریک بھی قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام تحریکوں میں شاہ ولی اللہ کی تحریکِ مجاہدین سب سے اہم ہے۔ ابتداً یہ ساری تحریکیں مذہبی رہیں مگر بعدہٗ ان کا دائرۂ عمل وسیع اور ان سب کا نصب العین مشترک ہوتا گیا۔ شمالی ہند میں شاہ ولی اللہ کی تحریک مجاہدین کو مرکزیت حاصل ہوتی گئی۔ وہ تحریک جو مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ، ان کے کردار اور مذہبی عقائد و رسوم کی درستی اور ان کے معاشی فلاح کے لیے وجود میں آئی تھی اور جس کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کی اپنی اخلاقی گراوٹ ہے اور ان کی اصلاح اس کے لیے مقدم ہے، انگریزوں کے خلاف پوری طرح صف آرا ہو گئی اور نعرۂ جہاد دے کر حریت کی آگ پورے ملک میں پھیلا دی۔ شاہ ولی اللہ مجاہدوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] خدنگِ غدر، معین الدین حسن خاں، مقدمہ خواجہ احمد فاروقی، ص ج د

"میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو اللہ نے جہاد کے لیے ...... بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنا لیا اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں[۱]"

وہ خالی دلوں میں پھر سے جذبۂ سرفروشی کے ساتھ عزم اور حرارت پیدا کرتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی ان کی تحریک کے نصب العین کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اٹھارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۲-۱۷۶۰) نے اپنی مہتم بالشان تحریک شروع کی، یہ تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، معاشی بھی اور ادبی بھی — اس تحریک نے بہت جلد سیاسی رنگ اختیار کر لیا اور وہ یہ کہ ملک کو بہت جلد انگریزوں سے پاک کیا جائے[۲]"

وطن عزیز کی خاطر ملک کی دیگر تحریکوں کا نصب العین بھی یہی ہوتا گیا۔ گورکھوں، راجپوتوں، مرہٹوں، سکھوں، سندھ کے امیروں اور اودھ کے نوابین کی عمل داریاں ختم ہوتی گئیں۔ انگریزوں کی قوت اور حکومت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ملک کے ہر مکتبۂ فکر کے لوگ انگریزوں کی سازشوں اور فریب کاریوں کو سمجھتے گئے۔ ان کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے موقع کے منتظر رہے۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کی تحریک نے اور بھی زور پکڑا:

"ان کے جانشینوں نے ان کی تحریک کو آگے بڑھایا اور ان کے پیدا کیے ہوئے سیاسی شعور کی روشنی میں ملک کی رہبری کی[۳]"

شاہ عبدالعزیز نے اس تحریک کی تمام ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے "انگریزوں

---

[۱] بحوالہ شاہ ولی اللہ دہلوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی (الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ۱۹۴۱ء) ص ۹۹

[۲] اردو میں وہابی ادب، خواجہ احمد فاروقی، ص ۱۷

[۳] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، مرتب خلیق احمد نظامی، ص ۹

کے خلاف فتویٰ جہاد دیا۔" جذبۂ جہاد سے مغلوب ہوکر مجاہدین سرفروشی کی تمنا میں جامِ شہادت نوش کرتے رہے۔ دیگر برادرانِ وطن بھی حب الوطنی سے سرشار ہوکر جذبۂ جہاد کے زیرِ اثر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک کے:

"متوازی شنکر آچاریہ کے حلقہ بگوشوں کی سنیاسی تحریک بھی میر قاسم کے زمانے سے برطانوی حکومت کے مظالم کے خلاف صف آرا تھی۔" [1]

رفتہ رفتہ ملک میں ہم آہنگی اور یکجہتی کی فضا قائم ہوتی گئی۔ جذبۂ جہاد سے ملک کا تقریباً ہر طبقہ بلا کسی تفریق مذہب و ملت سرشار ہوتا گیا:

"ہزاروں فقیر، پنڈت، سادھو اور سنیاسی ملک کے گوشے گوشے میں بغاوت کے جذبات ابھار رہے تھے۔ بااثر علمار نے جہاد پر زور دینا شروع کر دیا۔ دہلی کی جامع مسجد میں ایک فتویٰ ہوا جس میں انگریزوں کے خلاف ہر مسلمان کے لیے جہاد فرض قرار دیا گیا۔ علمار نے شہروں اور دیہاتوں کے دورے کیے، تقاریر کیں، رضا کاروں نے گھر گھر جاکر چندہ جمع کیا۔ فقیر اور سنیاسی زیادہ تر چھاؤنیوں کے قریب قیام کرتے جہاں سپاہی ان کے معتقد ہو جاتے۔" [2]

جو لوگ میدانِ جنگ کے بجائے صرف گفتار کے غازی تھے انھوں نے دوسرے طریق اپنائے مثلاً شہروں اور قصبوں میں مختلف ڈراموں، نظموں اور گیتوں کے ذریعے ہندوستانی عوام کو غلامی کا احساس دلایا۔ اس طرح ملک میں انگریزوں کے خلاف جو چنگاری سلگائی گئی وہ ۱۸۵۷ء میں بالآخر بھڑک کر شعلوں میں تبدیل ہوگئی۔ پہلی جنگ آزادی کا آغاز ۱۰ مئی کو میرٹھ کی چھاؤنی سے ہوا۔ میرٹھ سے ان شعلوں کی لپٹ نے پہلے دہلی پھر دیگر شہروں بعدہٗ پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر جو قلعۂ معلیٰ

---

[1] خدنگ غدر، ص ۵

[2] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۵۷

تک محدود تھا، سرفروشوں کی قیادت کے لیے باہر نکل آیا۔ نانا صاحب، رانی لکشمی بائی، تاتیہ ٹوپے، بیگم حضرت محل، شہزادہ فیروز بخت، عظیم اللہ خاں، کنور سنگھ، راجہ ہرنام سنگھ وغیرہ مختلف محاذوں کو سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ علماء کی خاصی تعداد بڑی تندہی سے سرگرم عمل رہی۔ اپنی شعلہ بیانیوں سے جذبۂ جہاد ابھارتی رہی اور خود بھی شوقِ جہاد میں مرتبۂ شہادت حاصل کرتی رہی۔ انگریزوں کے خلاف جم کر مورچہ لینے والوں میں علماء کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں نمایاں مقام احمد اللہ شاہ، حاجی امداد اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا فضل الحق خیرآبادی وغیرہ کو حاصل ہے۔ مگر چونکہ یہ بغاوت پوری طرح منظم نہ تھی اس لیے جنگ آزادی کے شعلے جس تیزی سے بھڑکے اتنی ہی تیزی سے سرد بھی پڑ گئے۔ ۱۹ر ستمبر کو اس ملک پر انگریزوں کا باقاعدہ قبضہ ہو گیا۔ انگریزوں کے پاس منظم فوج تھی، جدید سامان حرب تھا، مقامی جاسوسوں کی ایک تعداد تھی۔ بے شمار لوگ ذاتی مفاد اور اپنے بھائیوں سے بغض و عناد رکھنے کے سبب انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس طرح برادران وطن میں غداروں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ جانبازوں میں کوئی نظم نہ تھا۔ جدید سامانِ حرب کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ باقاعدہ سامانِ حرب کا بھی فقدان تھا۔ منصوبہ کے خلاف وقت سے بہت پہلے ہی یہ مورچہ کھول دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں محض جذبات سے جو نتائج نکلنے چاہیے تھے وہ نکلے۔ یوں شاہ ولی اللہ کی تحریک سے پیدا ہونے والی پہلی جنگِ آزادی کو کچل کر بظاہر ختم کر دیا گیا مگر:

> "ان کی تحریک نے سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا وہ ایک عرصہ تک قلب و جگر میں شعلہ کی طرح بھڑکتا رہا۔"[۱]

مذکورہ تحریک کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ:

۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۳

"ہندو اور مسلمان دونوں نے دوش بدوش یہ جنگ لڑی تھی اور ہندو مسلم سوال کسی شکل میں بھی لوگوں کے سامنے نہیں تھا — یہی وجہ تھی کہ وہ تمام طاقتیں جو کچھ عرصہ سے سلطنت مغلیہ کے مدِمقابل آگئی تھیں، بہادر شاہ کے گرد جمع ہوگئیں۔ مرہٹے ایک مدت سے مغلوں سے برسرِ پیکار رہتے، لیکن ۱۸۵۷ء میں پیشوا نے بہادر شاہ کو تسلیم کرنے میں مطلقاً کوئی عذر نہیں کیا۔ نانا صاحب کے خاص مشیروں میں عظیم اللہ خاں رہا۔ رانی جھانسی نے مسلمان توپچی ملازم رکھے۔ احمد اللہ شاہ نے ہندو اور مسلمان دونوں کے مشترکہ اجتماعات میں تقریریں کیں[1]"

بہر حال اس سیاسی انقلاب کے بعد ہی بدلے ہوئے حالات میں دانشوروں نے ازسرِنو ملکی اور قومی حالات کا جائزہ لیا اور رفتہ رفتہ قومی مفادات کے لیے کام کو آگے بڑھایا۔ سارؔوجنک سبھا (۱۸۷۰ء)، انڈین ایسوسی ایشن (۱۸۷۶ء)، مہاجن سبھا (۱۸۸۴ء) اور بامبے پریزیڈنسی ایسوسی ایشن (۱۸۸۵ء) کے بعد پورے ملک کی نمائندہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس[2] کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ابتداً اس جماعت کے مقاصد[3] محض اس حد تک تھے

---

[1] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۳۱

[2] ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو اے۔ او۔ ہیوم نے بمبئی کے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کے وسیع ہال میں اس کو قائم کیا۔

[3] رجنی پام دت نے اپنی کتاب "انڈیا ٹوڈے" میں یہ تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام دراصل انگریزوں کی حکمت عملی تھی۔ انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ہندوستان میں قومی بیداری کی لہر اٹھ رہی ہے اور پورے ملک میں جو ترقی پسند عناصر پروان چڑھ رہے ہیں ان کا یکجا ہو جانا لازمی اور فطری ہے۔ اس لیے اس دھارے کو اپنے ہاتھ میں لے لینا زیادہ قرینِ مصلحت ہے۔

بحوالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ص ۲۱

کہ سیاسی، اور دستوری اصلاحات کی جائیں لیکن بیسویں صدی کے آغاز کے بعد اس کا دائرۂ فکر وسیع ہوتا گیا اور وہ تال میل ختم ہوتا گیا جو حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان قائم ہوا تھا اور جس کے تحت امور مملکت و حکومت کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے مشوروں اور خود ان کو بھی شامل کرنا تھا۔ اس کے ہراول دستے کے اعتدال پسندوں کے ذریعے "ہوم رول" کی مانگ کی جا چکی تھی۔ کچھ سرفروشوں کی جانب سے آزادی کا مطالبہ بھی پیش کیا جا چکا تھا جس کی خاطر وہ ہر قربانی و ایثار کے لیے تیار تھے[1]۔ انڈین نیشنل کانگریس اختلاف رائے کا شکار ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو چکی تھی (۱۹۰۷ء)۔ ایک گروپ جس کے نمائندے دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ، سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشن گوکھلے اور مدن موہن مالویہ تھے، ہوم رول کے حق میں تھا۔ مکمل آزادی کو قومی مفادات کے خلاف سمجھتا تھا۔ دوسرا گروپ ہر قیمت پر آزادی کا متوالا تھا اور مکمل آزادی کے سوا کسی دوسری بات پر رضامند نہ تھا۔ اس گروپ کی شہرت گرم دل کے نام سے ہوئی جس کے نمائندے بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال اور اربندو گھوش تھے جو اپنے اخبار کیسری، مراٹھا اور وندے ماترم کے ذریعے حکومت کو کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنائے ہوئے تھے اور طلبہ کو فوجی تربیت حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ تقسیم بنگال[2] کے بعد مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) عمل میں آ چکا تھا۔ بال گنگا دھر تلک اور حسرت موہانی کو ان کی زیر زمین سرگرمیوں

---

[1] ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کے اجلاس میں کانگریس نے سوراج کا مطالبہ کر دیا اور سودیشی بائیکاٹ اور قومی تعلیم کے ریزولیوشن پاس کیے۔

اہل ہند کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر تاراچند، ص ۵۲۶

[2] ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے فیصلہ کیا کہ بنگال کو تقسیم کر دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہندو کمزور پڑ جائیں گے اور ایک مستقل خلیج ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھے گی۔

ہماری آزادی، ابوالکلام آزاد، ترجمہ محمد مجیب ص ۱۴

کی بنا پر جیل بھیجا جا چکا تھا[۱]۔ حکومت نے مارلے ایکٹ[۲] کے تحت عوام کو مراعات دینی چاہیں تو گرم دل نے اس کو ٹھکرا دیا تھا جب کہ دوسرا گروپ اسے قومی مفادات کے حق میں خیال کرتے ہوئے ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا خواہش مند تھا۔ پہلی جنگ[۳] عظیم شباب پر تھی۔ تلک رہا ہو کر باہر آ چکے تھے۔ مسز اینی بیسنٹ مختلف سیاسی جماعتوں کے اتحاد[۴] کے لیے اپنی کوششیں

---

[۱] دونوں کو باغیانہ مضامین لکھنے اور شایع کرنے کا مجرم قرار دے کر بغاوت کی دفعات میں ماخوذ کیا گیا۔ حسرت ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں گرفتار ہوئے اور اس کے دوسرے دن ۲۴ر جون کو تلک بمبئی میں گرفتار اور سزایاب ہوئے۔

مشاہداتِ زنداں، آج کل، دہلی، حسرت موہانی نمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۰

[۲] ۱۵ر نومبر ۱۹۰۹ء کو ایکٹ کا نفاذ عمل میں آیا۔

[۳] ۲۸ر جون ۱۹۱۴ء کو مملکت آسٹریا کے تاج و تخت کے ولیعہد آرچ ڈیوک فرینک فرڈیننڈ کو سرجیوو کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ سرجیوو آسٹریا کے صوبہ باسینا کا دارالسلطنت تھا۔ باسینا پہلے سربیا کی قدیم حکومت میں شامل تھا۔ آسٹریا نے سربیا کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا اور سربیا کے خلاف ۲۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کو اعلانِ جنگ کر دیا۔ روس عرصہ سے سربیا کا حامی اور سرپرست تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جرمنی نے روس کو منع کیا اور روس کے نہ ماننے پر اس کے خلاف ۳۰ جولائی ۱۹۱۴ء کو جس دن بلگریڈ پر گولہ باری ہو رہی تھی روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس روس کا حلیف تھا اس لیے ۳ر اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی نے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا اور فرانس پر حملہ کرنے کے لیے بلجیم سے راستہ مانگا۔ برطانیہ، پروشیا، فرانس، آسٹریا اور روس نے ۱۸۳۹ء میں بلجیم کی غیر جانبداری کے تحفظ کی گارنٹی کی تھی اس لیے برطانیہ نے جرمنی کو الٹی میٹم دیا کہ وہ بلجیم سے راستہ نہ طلب کرے۔ جرمنی کے کچھ جواب نہ دینے پر ۴ر اگست ۱۹۱۴ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۲۳ر اگست ۱۹۱۴ء کو جاپان نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا ـــــ نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گیا۔

تحریکِ خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی۔ ص ۵۲ تا ۵۸

[۴] یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مسز بیسنٹ نے تمام سیاسی جماعتوں اور فرقوں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲ پر)

شروع کر چکی تھیں۔ ریشمی رومال تحریک نے زور پکڑا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور جمعیتہ العلماء ہند نے حکمراں طبقہ کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی جانب تلک جی کی کوششیں کامیاب رہیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ[1] ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء اور پھر ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس اور اشتراکی نظام عالمی سطح پر اپنے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ برِصغیر کا خاص دانشور طبقہ اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ رولٹ ایکٹ[2] کے خلاف ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو پورے ملک میں عام ہڑتال منائی گئی جو بڑی حد تک کامیاب رہی۔ ردِ عمل کے طور پر ۱۳ اپریل کو جلیان والا باغ میں سیف الدین کچلو اور ستیہ پال کی گرفتاری پر مظاہرے کے لیے جمع ہونے والے نہتے ہجوم پر جنرل ڈائر کے سپاہیوں نے سولہ راؤنڈ گولیاں چلائیں جس میں سینکڑوں ہندوستانیوں کی جانیں ضایع ہوئیں اور ہزاروں معصوم لوگ زخمی ہوئے۔ اس خونی حادثہ نے سرفروشوں کو ایک نئی امنگ عطا کی۔ خلافت تحریک نے یکجہتی و ہم آہنگی کی فضا کو قائم کرتے ہوئے ایک مشترک محاذ کھولا۔ عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک نے شدت اختیار کی جس نے حکومت وقت کو بوکھلا دیا۔ نتیجہ کے طور پر سارے ملک میں عام گرفتاریاں ہوئیں۔ گاندھی جی سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے ہی والے تھے کہ گورکھپور کے قریب چوری چورا نامی گاؤں میں

(صفحہ ۴۱ کا بقیہ حاشیہ) کو سوراج کے مطالبہ کے لیے متحد کرنے کی غرض سے ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی۔

اہلِ ہند کی مختصر تاریخ۔ ص ۵۲۹

[1] مسلم لیگ اور کانگریس کے قائدین میں لکھنؤ میں ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ ۱۹۱۶ء کے 'میثاق لکھنؤ' کے نام سے مشہور ہے۔

[2] یہ قانون ۱۷ مارچ ۱۹۱۹ء کو پاس ہوا۔ گاندھی جی نے اسے 'کالا قانون' کے نام سے پکارا اور ۶ اپریل کو اس کے خلاف زبردست مظاہرے کا اعلان کیا۔

بھارت کا راشٹری آندولن ایوم سنودھانک وکاس۔ ص ۱۳۳

پولیس اور کسانوں کے درمیان تصادم میں چند سپاہیوں سمیت ایک پولیس چوکی کو جلا دیا گیا جس سے گاندھی جی کو بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کر دی۔ اس کے التوا پر موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مولانا حسرت موہانی، سبھاش چندر بوس، ایم۔ این۔ رائے، جواہر لال نہرو اور دوسرے رہنماؤں نے حیرت، غم اور غصّے کا اظہار کیا۔ ۱۰ر مارچ ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی بھی گرفتار کر لیے گئے اور انھیں بدامنی پھیلانے کے جرم میں چھ سال کی سزا سنائی گئی۔ تحریک سول نافرمانی کے التوا سے عام بددلی اور مایوسی کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور کانگریس اندرونی اختلافات کا شکار ہونے لگی تھی۔ ایسی صورت میں موتی لال نہرو اور چترنجن داس نے کانگریس میں ایک ضمنی پارٹی "سوراج پارٹی"[1] کے نام سے قائم کی۔ مزدور تحریک اور نیشنلسٹ پارٹی[2] کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ اشتراکی محنت کشوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کا آغاز کر چکے تھے۔ مزدوروں میں بیداری کی لہر دوڑ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ ہوم رول کا مطالبہ کمزور ہوتا گیا۔ مکمل آزادی کی مانگ زور پکڑتی گئی۔ گاندھی جی اپنی عدم تشدّد کی بات پر اٹل تھے اور اسے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے بہتر سمجھتے تھے۔ حریت پسند انقلابیوں کا بھی ایک گروپ ابھر کر سامنے آچکا تھا جو تشدّد کے راستہ پر سرگرم عمل تھا اور وطن کی آزادی کی خاطر ہر قربانی کو تیار تھا۔ "ڈومینین اسٹیٹس" کی برطانوی تجویز کے ساتھ ساتھ اگست ۱۹۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کو بھی منظور کر لیا گیا تھا۔ بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت "بہروں کو سنانے کے لیے" مرکزی اسمبلی میں بم اور "سرخ پمفلٹ" پھینک چکے تھے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس نے بھی مکمل آزادی کے نصب العین کا

---

[1] یہ پارٹی یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو وجود میں آئی۔

[2] محمد علی جناح، سوراجیہ کے اراکین اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے اشتراک سے ایک ملی جلی پارٹی وجود میں آئی جس کا نام "نیشنلسٹ پارٹی" رکھا گیا۔

جدوجہد آزادی میں مرکزی مجلس قانون ساز کا رول، منورنجن جھا، ص ۶۵۔ ۶۶

اعلان کیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء "یوم آزادی" قرار دیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو "نمک قانون" توڑنے کے لیے گاندھی جی نے سابرمتی آشرم سے اپنی مشہور "ڈانڈی یاترا" شروع کی۔ ۲۰ اپریل کو ان کی درخواست پر خواتین بھی اس میں شریک ہوگئیں۔ گول میز کانفرنس کے بعد آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نراین کے ذریعے "سوشلسٹ پارٹی" کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت :

"ملک کے اندر کسانوں اور مزدوروں میں ایک خاص احساس ترقی پذیر ہوا، جس کی وسعت اور شدت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھی اشتراکی اصولوں کی آواز اٹھی۔" [۱]

ملکی سیاست کے یہ سارے اتار چڑھاؤ جنھوں نے پوری قومی زندگی کو متاثر کر دیا تھا، دوسرے دانشوروں اور ادیبوں کی طرح پریم چند کو بھی تحریک دے رہے تھے کہ وہ عوام میں حب الوطنی کے جذبے کو تیز تر کریں۔ اسی جذبۂ حریت کے زیر اثر پریم چند نے اپنی تخلیقات کے سہارے ہندوستانیوں کو مادرِ وطن کی عظمت کا احساس دلایا اور ان میں سرفروشی کی تمنا پیدا کی۔ وہ افسانہ "قاتل" (آخری تحفہ) میں ایسے مجاہدوں سے متعارف کراتے ہیں جن کا کہنا تھا :

"یہ انفرادی جنگ نہیں۔ انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے، میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کرسکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔"

افسانہ کا ہیرو دھرم ویر، قربانی اور آزادی کے جذبے سے معمور ہے۔ اس کی بیوہ ماں اس کے خطرناک عزائم سے خوفزدہ ہے مگر وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہتا ہے :

---

[۱] اردو ادب کی ایک صدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۱۰۳

"دیکھ اماں! کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت آئے گی۔ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔"

دھرم ویر حصولِ آزادی کے سلسلہ میں ماں کو اپنے اقدامات کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہے:

"وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں گے تو آج ہی سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا، آئرلینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔"

ماں اپنے بیٹے کی ان لرزہ خیز باتوں کو سن کر خوف محسوس کرتی ہے اور اسے سبھا سے الگ ہو جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ دھرم ویر ماں کے جذبات کی قدر کرنے کے باوجود اس سے کہتا ہے:

"تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے اسے تمھارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں لیکن مادرِ وطن نے تمھیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لیے تمھیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے کبھی منھ نہ موڑ سکوں گا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے لیکن تلوار تمھاری گردن پر ہوگی۔ ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلے میں کسی چیز کی حقیقت نہیں۔ اس لیے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔"

پریم چند کی تحریروں میں شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کا بھی

بہت کچھ تاثر ملتا ہے۔ جہاد میں شہادت حاصل کرکے زندۂ جاوید ہوجانے کا تصور، وطنِ عزیز کے لیے مر مٹنے کی تڑپ، آزادی کی خاطر سب کچھ نثار کردینے کی تمنا ایک مجاہد کی نمایاں خوبیاں ہوا کرتی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں اور کرداروں میں جابجا شاہ صاحب کے مجاہدین کا عکس ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں آزادی کے لیے جو تیزی، تندی اور حرارت ملتی ہے وہ بہت کچھ شاہ صاحب کے مجاہدین کی مرہونِ منّت ہے۔ وہ افسانہ "جیل" (آخری تحفہ) میں اپنے احساسات کو بڑے جذباتی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ افسانہ کا ہیرو شمبھو اپنی محبوبہ روپ متی سے کہتا ہے:

"ذرا سوچو میری جان کی قیمت کیا ہے، ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد بھی سو روپئے کی ملازمت! بہت بڑھا تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا؟ جانتی ہو سارے ملک کے لیے سوراج، اتنے عظیم مقصد کے لیے مرجانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔"

"دنیا کا سب سے انمول رتن" میں پریم چند لکھتے ہیں:

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شئے ہے۔"[1]

"چوگانِ ہستی" میں رانی جانھوی اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر کہتی ہے:

"نوجوانو! میں کہوں گی جاؤ اور وِنئے کی طرح قربان ہونا سیکھو۔ ملک کی آنکھیں تمھاری طرف لگی ہوئی ہیں۔"[2]

"شیخ مخمور" (سوزِ وطن) میں پریم چند انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] تعمیر، ہریانہ، میرا پہلا افسانہ نمبر، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۱

[2] چوگانِ ہستی، پریم چند، ص ۳۶۴

"نہیں ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم میدان میں رہیں گے اور دست بدست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینوں میں ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں ___ ہم دشمن کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اپنے پیارے جنت نشاں کے لیے اپنا خون پانی کی طرح بہائیں گے۔"

پورے ملک میں مختلف سماجی اور سیاسی تحریکیں، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں سرگرم عمل تھیں اور عوام کو دعوت فکر و عمل دے رہی تھیں۔ مگر ان سرگرمیوں کے مراکز شہروں میں تھے۔ وسائل کی آسانی کے سبب شہر ایک دوسرے سے مربوط تھے اور اخبارات باخبر رکھنے کا ایک ذریعہ بن چکے تھے۔ لیکن ملک کی آبادی کی اکثریت تو دیہات پر مشتمل تھی۔ دیہات بھی ایسے، جہاں رسائی مشکل سے ممکن ہو پھر وسائل کی اس قدر کمی تھی کہ ان سے رابطہ قائم رکھنا دشوار ترین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اسی سبب ان تحریکوں کی کاوشیں شہروں میں تو کامیابی سے ہم کنار ہو چلی تھیں مگر دیہاتوں میں ان کے اثرات کما حقہٗ مرتب ہونا ممکن نہ تھا۔ پریم چند نے بحیثیت ادیب ان تحریکوں اور ان سے متعلق بعض شخصیتوں سے متاثر ہو کر دیہی عوام کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس جذبۂ بیداری کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اور بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی جو مختلف تحریکوں کے اصل محرک تھے۔

وہ:

"ہمارے سالہا سال کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی اور تاریخی ارتقا کی ایک مضبوط کڑی ہیں جنھیں ایک گھٹنے ہوئے نظام اور گھٹنے ہوئے ماحول نے پیدا کیا لیکن ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کو نظر انداز کر کے ان کے عہد کی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ پریم چند کی زندگی میں جہاں کہیں بھی، جو بھی اور جیسی بھی جد و جہد ہوئی ہو، وہ اس کے

منظر یا پس منظر میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔" [1]

بقول سری نواس لاہوٹی ان کی :

"سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کی عکاسی کرتے تھے بلکہ اس کے آگے کی بات بھی سوچتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی سماج کی ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دینے میں جانبداری سے کام لیا۔ ان کی یہ جانب داری صرف انقلاب زندہ باد کا نعرہ نہیں تھی بلکہ انھوں نے "دیموتراف" کے اس قول کو بھی پورا کیا کہ ادیب کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ صرف انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر خاموش ہو جائے بلکہ ادیب کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ انقلابی طاقتوں کے سنوارنے میں مدد دے تاکہ اس کا ادب اور فن نکھر سکے۔" [2]

ڈاکٹر معین الدین عقیل کے الفاظ میں ان کو :

"اس امر کا احساس ہو چلا تھا کہ سیاسی آزادی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک نچلے طبقہ بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کو اس جدوجہد میں شریک نہ کیا جائے۔" [3]

اس لیے انھوں نے سب سے پہلے انھیں "مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا" ورنہ اس سے بیشتر بھی :

"دیہات تھے۔ دیہاتی تھے۔ غربت تھی۔ افلاس تھا۔ لوٹ کھسوٹ تھی —— ناانصافی تھی ظلم و جبر تھا۔ کسان، مزدور کو بھر پیٹ کھانا نصیب نہ ہوتا تھا۔ بیماری تھی۔ ان کے نام تھے مگر ان کو کوئی جانتا نہیں تھا۔"

---

[1] دید و دریافت، نثار احمد فاروقی، ص ۱۳۷

[2] پریم چند کا ذہنی ارتقاء (شاعر، بمبئی، جون ۱۹۷۱ء) ص ۱۷

[3] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۵۶۶

[4] منشی پریم چند اردو میں نئے افسانے کے بانی، رام لال نابھوی (پرواز ادب، نومبر ۱۹۸۰ء) ص ۶۶

پریم چند کی کوششوں سے :

"پہلے پہل لوگوں نے دیہاتی زندگی کو اپنے ملک کی زندگی کا ایک حصہ سمجھنا شروع کیا اور اسی احساس نے رفتہ رفتہ دیہاتی زندگی اور اس زندگی کے چھوٹے بڑے مسئلوں کو سیاسی ادراک کی بنیاد بنا دیا۔ یہاں تک کہ اب ہماری ساری قومی اور سیاسی تحریکوں کا تار دیہاتی اور اس کی زندگی سے بندھا ہوا نظر آنے لگا۔" [1]

شیورانی دیوی کے مطابق، ایک بار پریم چند نے ان سے کہا تھا :

"یہاں اسی فیصدی کاشتکار بستے ہیں، بیس فیصدی اور لوگ — اگر ان میں اتنی ہی قوت اور بصیرت ہوتی تو آج یہ مٹھی بھر انگریز ہمارے ملک میں ڈیڑھ سو سال سے حکومت نہ کرتے ہوتے۔" [2]

مذکورہ چند تحریکوں کے علاوہ اور بھی متعدد تنظیمیں وجود میں آکر سرگرم عمل ہو چکی تھیں۔ پریم چند نے ان تمام تحریکوں کے مثبت پہلوؤں کے تاثر کو قبول کیا اور اپنے قلم کے زور سے ان کی کم و بیش آبیاری کرتے رہے۔ وہ دیہات کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے مسائل سے کما حقہٗ آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مفاد پرست مذہب کی آڑ میں بھولے بھالے عوام کا اور زمیندار و سرمایہ دار غریب کسانوں و مزدوروں کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ وہ واقف تھے کہ تعلیم کی کمی اور غیر ملکی حکمرانوں کی چشم پوشی نے ایسے مواقع فراہم کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں انھیں سب مسائل کو اجاگر کیا۔ معاشرے کی برائیوں کو اس طرح پیش کیا کہ ذہنوں پر مثبت اثرات مرتب ہوں اور ساتھ ہی تحریکوں کی کامیابی کے لیے راہ ہموار ہو۔ اسی سبب ان کی تخلیقات ان تحریکوں کے عوامل و محرکات کی آئینہ دار بن گئی ہیں :

---

[1] نیا افسانہ، وقار عظیم، ص ۱۹

[2] پریم چند گھر میں، شیورانی دیوی، ص ۱۴۴

"انھوں نے اپنے فن کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے"[1]

اور اپنا زورِ قلم تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے، جاگیر دارانہ نظام اور اس کے اندر پنپنے والی ذہنیت کا پردہ فاش کرنے، استحصال پسندوں کو بے نقاب کرنے، ذات پات کی تفریق کا انسداد کرنے، قدیم و فرسودہ رسوم کو مٹانے اور عورتوں کو ان کا سماجی مرتبہ دلانے پر صرف کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے حب الوطنی کی وہ روح پھونک دی کہ ہر فرد بیدار ہو گیا۔ حریت پسندی کی ایسی چنگاری سلگائی کہ غلامی کی لعنت بالآخر جل کر خاک ہوئی اور ملک آزاد ہوا۔

---

[1] تنقیدی تجربے، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۳۱۵

"پریم چند .... پہلے ادیب ہیں جن کی نظر حیاتِ انسانی
کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک
پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح
صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے
انھیں زبان دی۔ ازلی پسپائی اور پسماندگی کے شکار
یہ ہندوستان کے دبے کچلے کروڑوں انسان تھے جو
ملک کی غالب اکثریت، تہذیب و شان و شوکت کے
خالق تھے۔"

ڈاکٹر قمر رئیس

ہوری ــــ ایک علامتی کردار

پریم چند گاؤں کی زندگی کی حقیقتوں، اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور سماجی جبر سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء کے "ہنس" کے ایک شمارہ میں لکھا تھا:

"پرجا کے پاس لگان دینے کو کچھ نہیں، مگر سرکار لگان وصول کر کے چھوڑے گی، چاہے کسان بک جائے، چاہے زمین بے دخل ہو جائے، اس کے برتن بھاڑے، بیل، بچھیا، اناج، بھوسا سب کا سب بک جائے۔" [۱]

اس کے بعد ۸ مئی ۱۹۳۳ء کے "جاگرن" میں بھی انھوں نے لکھا:

"ہندوستانی کسانوں کی اس وقت جیسی قابلِ رحم حالت ہے اسے لفظوں میں پیش نہیں کر سکتا۔ ان کی بدحالی کو وہ خود جانتے ہیں یا ان کا خدا جانتا ہے۔"

اور اپنے ناول "گئو دان" میں انھوں نے وقت کے اسی اہم ترین مسئلہ کی جانب قاری کو تفصیلاً متوجہ کیا ہے۔ بقول ممتاز حسین:

جس زمانے میں کہ منشی پریم چند نے یہ ناول لکھا ہے اس زمانے کے سماجی ماحول اور زمینی رشتوں کے پس منظر میں جس چیز کو کسانوں کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے وہ اس کی زمین کی

---

[۱] بحوالہ "کہانی کار" (ہندی) سہ ماہی۔ وارنسی (پریم چند نمبر جولائی۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء) ص ۳۰

ملکیت کا مسئلہ رہا ہے۔ زمین پر ملکیت کیوں کر حاصل کی جائے اور اس ملکیت کو زمینداروں اور تعلقہ داروں کی بے دخلی سے کیوں کر محفوظ رکھا جائے۔ زمین کے اسی بندھن اور اسی حقِ ملکیت کے گرد ان کی طبقاتی نفسیات کا تانا بانا بنتا رہا ہے۔" [1]

یہ اس عہد کا المیہ تھا جب ملک غلام تھا اور جاگیردارانہ نظام کی گرفت پوری طرح مضبوط تھی۔ اس وقت کسی کسان کا:

"اپنی موروثی یا شکمی زمین سے چمٹنا اور اسی کے لیے اپنی جان و مال کی بازی لگا دینا ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ منشی پریم چند نے ہوری کی سب سے بڑی جدوجہد اپنے اسی تین بگھے کو بے دخلی سے بچانے ہی کو ٹھہرایا ہے جو شکمی تھا۔" [2]

اس نظام کی دین یہ تھی کہ زمیندار من مانی کرنے کے لیے آزاد تھے اور اپنی کسی بھی خواہش کی تکمیل کے لیے ان کو انسانی قدروں کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہ تھا۔ کسانوں کی محنت کا فائدہ خود اٹھاتے اور اپنے عالیشان ایوان کی تعمیر کرتے "گئودان" ان تمام پہلوؤں کو سمیٹتے ہوئے، دیہی معاشرے کے چہار جانب بکھری ہوئی غربت، افلاس، پسماندگی اور غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے والی رسوم کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ سارے محرکات و عوامل سامنے آجاتے ہیں جو ان حالات کے ذمہ دار ہیں۔ چند نفوس کس طرح سالہا سال سے عام کسان اور محنت کش طبقہ کا استحصال کرتے آئے ہیں، کسانوں کا یہ طبقہ کیسے ان کے جبر و ظلم کا نشانہ بنتا رہا ہے اور کیوں کر وہ ان کا شکار بننے کے لیے مجبور مجبور ہوتا ہے، ان کا جواب گئودان میں قاری کو پوری طرح مل جاتا ہے اور اس کو ایک عام کسان کی محرومیوں اور ناکامیوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] ادب اور شعور، ممتاز حسین۔ ص ۲۶۶

[2] ایضاً ص ۲۶۷-۲۶۸

اس کے علاوہ دیہی زندگی کی دیگر تمام پہلوؤں کی بھی ایسی بھرپور عکاسی اس میں کی گئی ہے کہ روزمرہ کی چہل پہل، ہنسی مذاق، وہاں کی مصروفیات اور معمولات، پسماندہ طبقہ کے مسائل اور ان کی عارضی راحتیں، ان میں آپسی رشتوں کا پاس ولحاظ، ان کی باہمی رنجشیں و رقابتیں اور ان میں اپنائے گئے طور طریق اپنے حقیقی رنگ و روپ میں زندگی سے اس طرح ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ "گئودان" دیہی معاشرہ کی حقیقی تصویر بن گئی ہے۔ ایک ایسی تصویر جو آئینہ کا کام دیتی اور دیہی زندگی کو پوری طرح قاری کے ذہن پر منعکس کر دیتی ہے۔ بقول کشن پرشاد کول:

"اس سے زیادہ صاف آئینہ جس میں دیہاتی زندگی کی سب ہی قسم کی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، اردو زبان وادب میں دوسرا نہیں۔" [1]

ان کی دیگر تخلیقات کی طرح گئودان میں بھی:

"مقامی رنگ، مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں۔" [2]

انھیں اسباب کی بنا پر:

"پریم چند کے ایک نقاد نے، گئودان کو EPIC OF RURAL INDIA کہا ہے اور ان کے دیگر نقادوں نے اسے نہ صرف پریم چند کا کارنامہ بلکہ اردو ناول کی معراج بتایا ہے۔" [3]

پریم چند نے اپنی تخلیقات میں عموماً ایسے افراد کو موضوع بنایا جن کی زندگیاں مشقتوں سے عبارت ہوتیں اور جہدِ مسلسل میں بیت جاتیں۔ یہ

---

[1] گئودان کا جائزہ (نیا ادب)، مرتب قاضی عبدالغفار، ص ۱۷۶

[2] تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص ۲۲

[3] آج کا اردو ادب، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص ۱۸۶

لوگ ملک کی غالب اکثریت کی حیثیت رکھتے اور ان کی آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہوتی۔ انھوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک اپنی تحریروں سے اس مجبور، کمزور اور پسماندہ طبقہ کی بھرپور ترجمانی کی۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے ان کے مسائل سے ملک کی دیگر آبادی کو باخبر کیا اور ان کے درمیان ان پسے ہوئے لوگوں کے لیے ہمدردی کی فضا قائم کی۔ اس نصب العین کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنی تخلیقات کو وسیلہ بنایا۔ گئودان اس کی بہترین مثال ہے۔ دیہی زندگی کے تعلق سے پریم چند کا مطالعہ ذاتی مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے۔ بقول سلام سندیلوی انھوں نے:

"اس ناول میں اپنی ساری زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ سمو دیا ہے۔" [1]

مزید ان کے اندازِ فکر میں وسعت اور حقیقی بنیادوں پر زندگی کی پرکھ نے اس ناول کو سانس لیتی ہوئی دنیا سے اس طرح ہمکنار کیا کہ بالآخر دیہی معاشرے کے لیے ان کی انتھک کاوشیں بے پایاں خلوص سے گلے مل کر ہندوستانی رنگ و بو اپنے اندر سمیٹ لیتیں تو وہ گئودان کا روپ اختیار کر کے ہمارے ذہنوں کو مہکا جاتی۔

گئودان کا مرکزی کردار ہوری، ان کروڑوں کسانوں میں سے ایک ہے جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور زندگی کی مسرتوں سے دور، نیلے گگن کی چھاؤں تلے محنت و مشقت کے سہارے اپنا اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کا بوجھ اٹھانے کی انتھک کوشش کرتے ہیں۔ ماگھ پوس کی کپکپاتی رات اور جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ میں کمر توڑ محنت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اجرت اتنی پاتے کہ پوری طرح پیٹ کی آگ بجھانا بھی ان کے لیے ممکن نہیں ہو پاتا۔ دیگر ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کا سوال تو ان کے ذہنوں میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کبھی کسی خواہش نے جنم لیا تو اس کا انجام بڑا حسرتناک ہوتا

[1] منشی پریم چند کے ناول گئودان پر ایک نظر (فروغ اردو لکھنؤ، پریم چند نمبر، اپریل تا اگست ۱۹۷۰ء) ص ۸۷

ہے۔ ساری عمر تلخیاں سمیٹنا اور عمر کی آخری منزل پار کر لینا ان کا مقدر ہوتا ہے:

"یہ محنت کش اپنا خون پسینہ ایک کر کے زمین کا سینہ چیر کر دولت نکالتے ہیں، مگر اس دولت سے ان کو اتنا بھی حصّہ نہیں ملتا کہ وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھر سکیں یا تن ڈھک سکیں"۔[1]

اس طبقہ کی مجبوری و بے کسی کا اظہار ہوری جیسے جفاکش انسان کے اندازِ فکر سے ہو جاتا ہے:

"ابھی زندگی کے بڑے بڑے کام تو سر پر سوار ہیں، گوبر اور سونا کا بیاہ۔ بہت ہاتھ روکنے پر بھی تین سو سے کم نہ اٹھیں گے۔ یہ تین سو کس کے گھر سے آئیں گے؟ کتنا چاہتا ہے کہ کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لے اور جس کا آتا ہے اس کی پائی پائی چکا دے مگر ہر طرح کی تکلیف اٹھانے پر بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ اسی طرح سود بڑھتا جائے گا اور ایک دن اس کا سب گھر بار نیلام ہو جائے گا، تو اس کے بال بچے بے سہارا ہو کر بھیک مانگتے پھریں گے"۔[2]

اس عہد کے ایک عام کسان کی زندگی کیسے بسر ہوتی ہے اور اس پر کیا بیتتی ہے۔ سرما کی طویل راتیں وہ کس طرح کاٹتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہوری کی حالتِ زار کا مطالعہ ضروری ہے:

"ہوری کھانا کھا کر بنیا کے مٹر کے کھیت کی مینڈ پر اپنی جھونپڑی میں لیٹا ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ ٹھنڈ کو بھول جائے اور سو رہے مگر تار تار کمبل اور پھٹی ہوئی مرزئی اور ٹھنڈ سے گیلا پوال، اتنے بیریوں کے سامنے آنے کی ہمت نیند میں نہ تھی۔ آج تمباکو بھی نہ ملا کہ اس سے دل بہلتا۔ اُپلا سلگا لایا تھا پر وہ بھی ٹھنڈ سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ بِوائی پھٹے پیروں کو

---

[1] آج کا اردو ادب، ص ۳۱

[2] گئودان، پریم چند، ص ۵۷

پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ میں دبا کر اور کمبل میں منہ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔"[1]

گئودان اس عہد کے کسان کی مجبوری، بیچارگی اور محرومی کی ایک ایسی داستان ہے جو قاری کو بہت کچھ سوچنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"پریم چند نے دیہاتی زندگی کے مناظر کو حقیقت کے رنگ میں دکھا کر ہندوستان کی اصل آبادیوں کے کوائف اور ان کی نفسیات سے پردہ اٹھا دیا۔"[2]

انھوں نے ہوری کے وسیلہ سے دیہی پسماندہ طبقہ کے احوال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی بے کیف زندگی اور مظلومیت نگاہوں میں پھر جاتی ہے اور یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ جانوروں کی طرح بسر کرنے کے لیے مجبور کر دیے گئے ہیں:

"گھر کا ایک حصہ گرنے کے قریب تھا۔ دروازہ پر ایک بیل بندھا ہوا تھا اور وہ بھی ادھ مرا ــــ یہ حالت کچھ ہوری ہی کی نہ تھی، سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی۔ ایسا ایک آدمی بھی نہ تھا جس کی حالت زار نہ ہو۔ گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بیٹھی ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے، کام کرتے تھے، پستے تھے، صرف اس لیے کہ ایسا ہونا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی امنگ، گویا ان کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو۔"[3]

---

[1] گئودان، ص ۱۹۳

[2] اردو ادب کی ایک صدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۱۸۳

[3] گئودان، ص ۵۸۲

گاؤں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں گائے کی اہمیت، نجی ملکیت کے سبب باہمی رقابتیں، جھگڑے، تفریق اور تباہی و بربادی کو گئودان کے ذریعہ اجاگر کیا گیا ہے۔ مادّی حقیقتیں روحانی عقیدوں کا تعین کس طرح کرتی ہیں یہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ ناول کا پورا پھیلاؤ "گئو" اور "دان" دو لفظوں کے درمیان ہے اور دیہی زندگی میں گائے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ گائے کے دودھ سے گھر کے افراد پرورش پاتے ہیں اور اس کے بچھڑے کاشتکاری کا اہم ترین ذریعہ بنتے ہیں۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی گائے کی موجودگی آسودگی اور روحانی سکون بخشتی ہے۔ انھیں خیالوں کے تحت دیہات کا ہر فرد گائے پالنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ ہوری کی بھی تمنا ہے:

> "جو روایتی معاشرے میں ہر ہندوستانی کسان کی ہوتی ہے یعنی ایک گائے حاصل کرنے کی تمنا۔ یہ تمنا ہوری کی زندگی کی جدوجہد کا محور ہے۔"[1]

وہ سوچتا ہے کہ:

> "گئو سے تو دروازے کی سوبھا ہے۔ سبیرے سبیرے گئو کے درسن ہو جائیں تو کیا کہنا۔ نہ جانے کب یہ سادھ پوری ہوگی، وہ سبھ دن کب آئے گا۔"[2]

ہوری امکانی جتن کے باوجود اتنے پیسے جمع نہیں کر پاتا کہ گائے خرید سکے تو مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے بھولا اہیر کو دوسری شادی کی ترغیب دے کر گائے حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح عارضی طور پر ہوری کا دامن خوشیوں سے بھر جاتا ہے:

> "ہوری تج مچ آپے میں نہ تھا۔ گائے اس کے لیے صرف بھگتی کی چیز نہ تھی بلکہ زندہ دولت تھی۔ وہ اس سے اپنے دروازے کی رونق اور گھر

---

[1] پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو، اصغر علی انجینیر (آج کل، دہلی، پریم چند نمبر ۱۹۸۰ء) ص ۱۴

[2] گئودان ص ۸

کی عظمت بڑھانا چاہتا ہے کہ لوگ گائے کو دروازے پر بندھی دیکھ
کر پوچھیں کہ یہ کس کا گھر ہے ؟ لوگ کہیں ہوری مہتو کا۔" [۱]

لیکن وہ دن اور تمام رات ہوری بڑی بے چینی سے گذارتا ہے۔ طرح طرح کے خدشات اس کو ستاتے ہیں۔ بھولا کے وعدے سے مکر جانے کا خیال رہ رہ کر اسے پریشان کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ گائے سے متعلق منصوبے بھی تیار کرتا رہتا ہے :

"ہوری کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ نیم کے پیڑ تلے اپنی بانس کی چارپائی پر پڑا بار بار تاروں کی طرف دیکھتا تھا۔ گائے کے لیے ایک ناند گاڑنی ہے۔ اس کی ناند بیلوں سے الگ رہے تو اچھا ہو۔ ابھی تو رات کو باہر ہی رہے گی لیکن چوماسے میں اس کے لیے کوئی دوسری جگہ ٹھیک کرنا ہوگی۔ باہر لوگ نظر لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ٹونا ٹوٹکا کر دیتے ہیں کہ گائے کا دودھ ہی سوکھ جاتا ہے۔" [۲]

علی الصباح وہ اپنے بیٹے گوبر کو بھولا کے پاس گائے لینے کے لیے بھیجتا ہے اور شام کو جب گوبر گائے کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے تو ہوری اپنے آپ کو سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا ہے :

"ہوری بھگتی بھری نگاہوں سے گائے کو دیکھ رہا تھا جیسے ساچھات (مجسّم) دیوی جی نے گھر میں قدم رکھا ہو۔ آج بھگوان نے یہ دن دکھایا کہ اس کا گھر گئو ماتا کے چرنوں سے پوتر ہو گیا۔ ایسے اچھے بھاگ ! نہ جانے کس کے پُن کے پھل ہیں۔" [۳]

گائے کی آمد ہوری کی زندگی میں بہار لے آتی ہے۔ وہ ہر وقت گائے کا ہی ذکر کرتا رہتا ہے۔ اس کی خوشی میں گھر کے دیگر افراد بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں تو گائے کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی

---

[۱] گئو دان، ص ۵۹ - ۶۰۔ [۲] ایضاً ص ۴۱۔ [۳] ایضاً ص ۵۹۔

ہیں۔ اس کو کچھ کھلائے بغیر اپنے منھ میں ایک لقمہ بھی نہیں ڈالتی ہیں لیکن ہوری کا چھوٹا بھائی ہیرا ان خوشیوں کو نہیں دیکھ پاتا ہے۔ اس کا دل حسد سے بھڑک اٹھتا ہے کہ وہ خود تو گائے سے محروم رہے اور ہوری اپنے گھر میں 'شاندار' گائے باندھے۔ اس حاسدانہ جذبہ کے تحت وہ گائے کے مذہبی تقدس کو بھی فراموش کرتے ہوئے ہوری کی خوشیوں کو پامال کرنے پر اتر آتا ہے اور موقع کا منتظر رہ کر، ایک دن وہ گائے کو زہر دے دیتا ہے۔ ہوری کے گھر میں کہرام برپا ہو جاتا ہے۔ اس کا بھرم پل بھر میں چکنا چور ہو جاتا ہے۔ ہوری جانتا ہے کہ اس کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے والا اس کا اپنا بھائی ہے جس نے زہر دے کر "گئو ہتیا" کی ہے پھر بھی وہ اس سے بازپرس نہیں کرتا بلکہ معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بات بڑھ جاتی ہے اور اس کی بیوی دھنیا اس سے کہتی ہے کہ بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کہ تو نے ہیرا کو گائے کے پاس کھڑا نہیں دیکھا۔ وہ کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ لمحہ اس کے لیے بڑا کربناک ہوتا ہے مگر بھائی کی ہمدردی اور خاندان کی عزت کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ جھوٹی قسم کھا لیتا ہے:

> "ہوری نے گوبر کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھ کر، کانپتی ہوئی آواز میں کہا 'میں بیٹے کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے ہیرا کو ناند کے پاس نہیں دیکھا۔'" [1]

"ہوری روایتی کسان ہے، روایت پرست، قدامت پرست، مذہبی، اپنی بات کا پکا، محنتی، اور ایماندار، ہر ظلم اور بے انصافی کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے والا" [2] اور لاکھوں کسانوں کی طرح رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا، روایتوں کو نباہنے اور 'مان مریادا' کو بحال

---

[1] گئودان، ص ۱۷۸

[2] آج کا اردو ادب، ص ۱۸۶

رکھنے کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ گنوا دیتا ہے۔ اپنی بساط سے بڑھ کر انسانی ہمدردی اور ایثار کا مظاہرہ اس کے لیے پریشانیوں کا سبب ہوتا ہے:

"وہ سب کو مان کر چلتا ہے۔ دھرم کو، ایشور کو، سماج کو، مرد کے گھریلو فرائض کو لیکن وہ چل نہیں پاتا۔ سب ہی کے نام پر اس کو لوٹا جاتا ہے ـــــ پنڈا پروہت، سماج کے نیتا اور ٹھیکہ دار، اس کے بھائی بھاوج سب اسے چھلتے ہیں۔"[1]

مگر وہ اپنی راہ سے ہٹتا نہیں ہے:

"ہیرا اس کی گائے کو زہر دے دیتا ہے جو اس کی زندگی کی عزیز ترین آرزوؤں کا ایک مجسمہ تھی لیکن وہ ہیرا سے انتقام لینے کے لیے تیار نہیں ہے اور اتنا دیالو ہے کہ اسے جیل سے بچانے کے لیے وہ اپنے پاس سے ڈنڈ بھرتا ہے۔"[2]

بیوی کی شدید مخالفت کے باوجود بھی وہ اس کو بچانے کے لیے ہر امکانی جتن کرتا ہے اور جس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ داروغہ اس کے بھائی کے گھر کی تلاشی لینے والا ہے تو وہ بدحواس ہو جاتا ہے:

"ہوری کا چہرہ ایسا فق ہو گیا گویا جسم کا سارا خون خشک ہو گیا ہو۔ تلاشی اس کے گھر ہوئی تو، اس کے بھائی کے گھر ہوئی تو، ایک ہی بات ہے۔ ہیرا الگ سہی پر دنیا تو جانتی ہے کہ اس کا بھائی ہے مگر اس سے اس کا کچھ بس نہیں۔ اس کے پاس روپئے ہوتے تو پچاس لا کر داروغہ جی کے پاؤں پر رکھ دیتا اور کہتا سرکار، میری آبرو اب آپ کے ہاتھ ہے مگر اس کے پاس تو زہر کھانے کو ایک پیسہ

---

[1] پریم چند ایک ادھین، ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر، ص ۱٦٦

[2] ادب اور شعور، ص ۲٦۴

نہیں ہے۔"[1]

اس موقع پر گاؤں کے "چاروں مُکھیا" (داتادین، جھنگری سنگھ، نوکھے رام اور پٹیشوری) جو سماجی جرائم کے سرچشمہ ہیں، داروغہ سے ساز باز کرکے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ ہوری داروغہ کو بطور رشوت روپئے ادا کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ داروغہ سے اپنا حق المحنت طے کرتے ہیں اور ساتھ ہی داروغہ کو دینے کے لیے ہوری کو رقم اس انداز سے مہیّا کرتے ہیں کہ خود ان کو ہوری سے بھی مالی منفعت حاصل ہو۔ ہوری وہ روپئے لے کر داروغہ کو دینے کے لیے جب جھنگری سنگھ کے گھر سے نکلتا ہے تو اس کی بیوی دھنیا غضبناک ہو کر اس سے انگوچھا چھین لیتی ہے۔ گانٹھ مضبوط نہ ہونے کے سبب "جھٹکے کے زور سے کھُل" جاتی ہے اور سارے روپئے زمین پر بکھر جاتے ہیں:

"یہ روپئے کہاں لیے جا رہا ہے؟ بتا! بھلا چاہتا ہے تو سب روپئے لوٹا دے۔ نہیں کہے دیتی ہوں! گھر کے آدمی رات دن مریں، دانے دانے کو ترسیں، جیتھڑا پہننے کو نہ ملے اور انجلی بھر روپئے لے کر چلا ہے اِجّت بچانے! ایسی بڑی ہے تیری اِجّت۔ جس کے گھر میں چوہے لوٹیں وہ بھی اِجّت والا ہے! دروگا تلاسی ہی تو لے گا، لے لے جہاں چاہے تلاسی۔ ایک تو سو روپئے کی گائے گئی۔ اس پر یہ پلیتھن! واہ رے تیری اِجّت!"[2]

"ہوری لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا"۔ اس کا بس چلتا تو وہ روپئے اٹھا کر داروغہ کو دے دیتا مگر بیوی کے سامنے وہ "مغلوب" ہو جاتا ہے۔ پھر بھی رکھ رکھاؤ، وقار اور بھرم کو برقرار رکھنے کی وہ پوری کوشش کرتا ہے۔ وہ قرب و جوار میں بھائی کو تلاش کرتا ہے۔ جب اس کہیں پتا نہیں چلتا تو اس کے کھیت

---

[1] گئودان، ص ۱۸۳ - [2] ایضاً ص ۱۸۶

اور بیوی (پنیا) کی طرف سے فکر مند ہوتا ہے اور دھنیا سے کہتا ہے :

> "گائے گئی سو گئی، میرے سر ایک بپتا ڈال گئی۔ پنیا کی چنتا مجھے مارے ڈالتی ہے۔" [۱]

گئودان میں پنچایت کا جو روپ سامنے آتا ہے وہ ہر حساس شخص کو ذہنی صدمہ پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ سماج کے سربرآوردہ لوگ جو صاحب ثروت، ذی اثر اور استحصال پسند ہوتے ہیں، پنچایت میں پنچوں کے روپ میں داخل ہو کر اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بدترین مثال گئودان میں اس وقت سامنے آتی ہے جب ہوری کا بیٹا گوبر، بھولا کی بیوہ بیٹی جھنیا کو گھر لے آتا ہے اور ہوری جھنیا کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنی بہو تسلیم کر لیتا ہے۔ ہوری کے اس فعل کو نہ تو سماج قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ پنچ۔ پنچایت اس پر سو روپیہ نقد اور تیس من غلّے کا جرمانہ کرتی ہے۔ دھنیا پنچوں کے اس فیصلہ پر ہنگامہ کرتی ہے لیکن ہوری دھنیا کو ڈانٹ کر خاموش کر دیتا ہے :

> "پنچ پرمیسر رہتے ہیں۔ ان کا جو نیائے ہے وہی میرے سر آنکھوں پر۔ اگر بھگوان کی یہی مرضی کہ ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ہمارا کیا بس ؟ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ کھلیان میں ہے، ایک دانہ بھی گھر میں نہیں آیا۔ جتنا چاہو لے لو۔ سب لینا چاہو تو لے لو، ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جتنی کمی پڑے اس میں ہمارے بیل لے لینا۔" [۲]

دھنیا ہوری کی بات نہیں مانتی ہے اور "بھرے ہوئے گلے سے کہتی ہے کہ "میرے جیتے جی یہ نہیں ہونے" "کو ہے" مر مر کر ہم نے کمایا" "ہے" اسی لیے کہ پنچ لوگ مونچھوں پر تاؤ دے کر بھوگ لگا دیں اور ہمارے بچے دانے دانے

---

[۱] گئودان، ص ۱۹۲۔ [۲] ایضاً ص ۲۰۹-۲۱۰

کو ترسیں"۔ سماجی جبر نے فرد کو کس طرح توڑ کر رکھ دیا ہے اور کسان کو کس حد تک مفلوج کر دیا ہے اس کی واضح مثال اس وقت سامنے آتی ہے جب ہوری بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی بیوی سے کہتا ہے :

" دھنیا! تیرے پیروں پڑتا ہوں، تو چپ رہ! ہم سب برادری کے چاکر ہیں، اس کے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ جو ڈنڈ لگاتی ہے اُسے سر جھکا کر مان لے"۔[1]

ہوری کے اس عاجزانہ رویّہ اور منّت وسماجت پر وہ "جھلّا کر" پنچوں کو برا بھلا کہتی ہے :

"یہ پنچ نہیں ہیں، راچھس ہیں۔ پکّے اور پورے راچھس! یہ سب ہماری جگہ جمین چھین کر مال مارنا چاہتے ہیں۔ ڈانڈ باندھ کا تو بہانہ ہے۔ سمجھاتی جاتی ہوں پر تمھاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تم اِن راچھسوں سے دَیا کا آسرا رکھتے ہو۔ سوچتے ہو کہ دس پانچ من تمھیں دے دیں گے۔ منھ دھو رکھو"۔[2]

مگر ہوری اپنے عقائد کی بنا پر رسم ورواج کے بندھنوں کو توڑنے سے قاصر ہے۔ وہ " برادری سے الگ رہ کر جینے کا" تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ پنچوں کے حکم کے بموجب وہ " پہر رات گئے" تک کھلیان سے اناج ڈھو ڈھو کر جھنگری سنگھ کی چوپال میں ڈھیر کرتا رہا۔ حالانکہ یہ احساس " روح کو خشک کیے" دیتا تھا کہ " کل بال بچّے کیا کھائیں گے" مگر " برادری کا خوف" اسے ایسا کرنے پر اکسا رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ فکر اور بھی کمر توڑے دے رہی تھی کہ ابھی " سو روپئے کی گٹھری تو سر پر سوار ہے۔" بیس روپئے تلہن" گیہوں اور مٹر سے مل گئے، باقی روپئے پورے کرنے کے لیے اس نے " اسّی روپئے پر جھنگری سنگھ کے یہاں" اپنا مکان " رہن کر دیا"۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس ہوری کی ساری مصیبتوں کا سبب یہ ہے کہ

---

[1] گئو دان ص ۲۱۰ ۔ [2] ایضاً ص ۲۱۱ - ۲۱۲

اس نے برادری کے عتاب سے بے خوف ہوکر جھنیا کی بے کسی اور مظلومی کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی بہو تسلیم کرلیا ہے لیکن پنڈت ماتا دین ہرکھو چمار کی لڑکی کو بطور رکھیل اپنے گھر رکھ لیتا ہے تو اس کے اس بدترین فعل پر نہ سماج معترض ہوتا ہے، نہ پنچایت باز پرس کرتی ہے:

"ماتادین ایک چماری سے آشنائی کیے ہوئے تھا۔ اسے سارا گاؤں جانتا تھا مگر وہ تلک لگاتا تھا، پوتھی پترا پڑھتا تھا، کتھا بھاگوت کہتا تھا اور پروہتی کا کام کرتا تھا۔ اس کے وقار میں ذرا بھی کمی نہ تھی۔ وہ روزانہ اشنان پوجا کرکے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کردیتا تھا۔"[1]

ماتادین پنچایت اور سماج دونوں کی گرفت سے دور رہتا ہے۔ اس کے سلیا سے ناجائز تعلقات ہیں مگر برہمن ہونے کے سبب اس پر کسی کو اعتراض کرنے کی جرأت نہیں اور اگر کبھی کسی نے جسارت کی تو داتا دین نے:

"مہابھارت اور پرانوں سے ان برہمنوں کی ایک لمبی فہرست پیش کردی، جنھوں نے دوسری ذات کی لڑکیوں سے تعلق پیدا کرلیا تھا اور ساتھ ہی یہ ثابت کردیا کہ ان سے جو اولاد ہوئی وہ برہمن کہلائی اور آج کل کے جو برہمن ہیں وہ اسی کی اولاد ہیں۔ یہ رواج شروع ہی سے چلا آرہا ہے اور اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔"[2]

لیکن ہوری کا فعل پنچوں کے نزدیک قابل معافی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ وہ ایک پسماندہ طبقہ کا فرد ہے۔ انسانی زندگی میں اسی تضاد اور تصادم کو پریم چند نے گئودان کے ذریعے پیش کیا ہے اور جاگیردارانہ نظام کے اس شرمناک پہلو کو اجاگر کیا ہے جہاں فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ وہ اپنے جذباتی، نجی مسئلے، پسند ناپسند کا بھی فیصلہ خود نہیں کرسکتا ہے۔

---

[1] گئودان ص ۲۰۳-۲۰۴۔ [2] ایضاً ص ۴۰۵

ہوری کی غربت اور پستی کا سبب جہاں دوسری قوتوں کا استحصال ہے وہاں اس کی اپنی ضعیف الاعتقادی بھی ہے۔ وہ جھوٹی عزت، نمود و نمائش اور روایتوں کے بندھنوں میں جکڑا رہتا ہے۔ ان بندشوں کو توڑنے کی وہ کوئی جدّو جُہد نہیں کرتا ہے۔ سنکھ کی آواز اور یہ خبر کہ گاؤں میں آرتی پوجا ہو رہی ہے اسے بے چین کر دیتی ہے:

"وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ تانبے کا ایک پیسہ! آرتی کے پُن اور مہاتم کا اسے بالکل دھیان نہ تھا۔ بات تھی صرف بیوہار کی۔ ٹھاکر جی کی آرتی ہو تو وہ صرف اپنی بھگتی کی بھینٹ دے سکتا تھا، مگر رواج کیسے توڑے؟ سب کی نگاہوں میں پوچ کیسے بنے؟"[1]

اسی طرح جب گوبر، پنڈت داتا دین کو دو سو روپیہ دینے سے انکار کرتے ہوئے اصل حساب کے مطابق ستّر روپے بتاتا ہے تو داتا دین ناراض ہو کر ہوری سے کہتا ہے:

"یہ سمجھ لو کہ ـــ میرے روپئے ہجم کر کے تم چین نہ پاؤ گے ـــ اگر میں براہمن ہوں تو اپنے پورے دو سو روپئے لے کر دکھا دوں گا اور تم میرے دوارے پر جاؤ گے اور ہاتھ جوڑ کر دے آؤ گے۔"[2]

ہوری داتا دین کے ان الفاظ کو سن کر گھبرا جاتا ہے۔ اس کے "پیٹ میں دھرم کی ہلچل" پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ روایتی اور اندھی عقیدت مندی سے مغلوب ہو کر سوچتا ہے:

"برہمن کے روپئے! اس کی ایک پائی بھی دب گئی تو ہڈی توڑ کر نکلے گی۔ ایشور نہ کرے کہ برہمن کا گُسّہ کسی پر گرے۔ گھرانے میں کوئی چلّو بھر پانی دینے والا، گھر میں دیا جلانے والا بھی نہیں رہ جاتا۔ اس کا

---

[1] گئودان ص ۳۰۸ ۔ [2] ایضاً ص ۳۶۰

مذہب پرست دل دہل اٹھا۔ اس نے دوڑ کر پنڈت جی کے پیر پکڑ لیے
اور درد بھری آواز میں بولا 'مہراج جب تک میں جیتا ہوں میں تمھاری
ایک ایک پائی چکاؤں گا۔'' [۱]

ممتاز حسین کے الفاظ میں ہوری :

'' جن سماجی اقدار، محبت و مروّت، ایثار و اکرام کا حامل ہے وہ
انھیں باوجود مصائب کے مرتے دم تک نبھاتا ہے۔ اس کا لڑکا گوبر
اسے طعنہ دیتا ہے کہ جس دیش میں افلاس و غربت ہو وہاں یہ قدریں
بے معنی ہیں لیکن ہوری اپنی ڈگر سے ہٹتا نہیں ہے۔'' [۲]

اس کے اس رویہ کو دیکھ کر گوبر غصہ بھرے انداز میں کہتا ہے کہ '' تمھیں لوگوں
نے تو ان سب سبھاؤ بگاڑ دیا ہے '' جس کی وجہ سے یہ '' من مانی '' کرتے ہیں۔
ہوری '' اپنے خیال سے سچائی کا پہلو '' لیتے ہوئے کہتا ہے :

'' دھرم نہ چھوڑنا چاہیے بیٹا۔ اپنی اپنی کرنی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ ہم
نے جس بیاج پر روپے لیے وہ تو دینے ہی پڑیں گے۔ پھر بامھن ٹھہرے،
ان کا پیسہ ہمیں پچے گا؟ ـــــ جب تک میں جیتا ہوں، مجھے اپنے
رستے چلنے دو۔ جب مر جاؤں تو تمھارے جی میں جو آئے وہ کرنا۔'' [۳]

ہوری کی پوری فصل جرمانے کی نذر ہو چکی ہے۔ مکان جھنگری سنگھ
کے یہاں رہن ہے۔ گائے کے بدلے بھولا نے دونوں بیل چھین لیے ہیں۔
داتا دین کو '' صرف بوائی کے لیے آدھی فصل دینی '' پڑی ہے بقیہ آدھی فصل
'' مہاجن '' نے لے لی ہے۔ قرض اور لگان بڑھتا جا رہا ہے اور وہ کسان سے
مزدور بن چکا ہے۔ پنڈت داتا دین سے اس کا '' پروہت اور ججمان کا ناتا ''

---

[۱] گئو دان ص ۳۶۰

[۲] ادب اور شعور ص ۲۶۴

[۳] گئو دان ص ۳۶۱ - ۳۶۲

ختم ہوکر "مالک اور مزدور کا رشتہ" قائم ہو چکا ہے۔ غرض کہ اس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جارہی ہے۔ اعصاب شکستہ اور ہمتیں پست ہونے لگی ہیں:

"زندگی کی جدو جہد میں اسے ہمیشہ شکست ملی، مگر اس نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ ہر شکست گویا اسے قسمت سے لڑنے کی طاقت دیتی تھی مگر اب وہ اس آخری حالت میں پہنچ گیا تھا جب اس میں خود اعتمادی بھی نہ رہ گئی تھی۔" [۱]

حالات و حادثات نے ہوری کے حوصلوں کو اتنا پست کر دیا ہے اور اسے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں اس سے کوئی بھی غیر انسانی فعل سرزد ہو سکتا ہے۔ بالآخر وہ اپنی تین بیگھے کی خاندانی زمین کو بچانے کی خاطر اپنی بیٹی روپا کو دو سو روپیہ کے عوض ادھیڑ عمر رام سیوک کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کے اس فعل کا ذمہ دار کون ہے؟ ہوری خود ہے یا وہ سماج اور مروجہ نظام جس نے ایسے حالات پیدا کیے ہیں کہ ہوری جیسے لوگ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہیں:

"ہوری نے روپئے لیے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر نہ اٹھ سکا منھ سے ایک لفظ نہ نکلا، گویا ذلت کے اتھاہ سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا رہا ہو۔ آج تیس سال زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا ہے اور ایسا ہارا ہے کہ گویا اسے شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے اور جو جاتا ہے وہ اس کے منھ پر تھوک دیتا ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ بھائیو! میں رحم کا مستحق ہوں، میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے۔ ماگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو اس میں کتنی جان رہ گئی ہے اور وہ کتنی چوٹوں سے چور اور ٹھوکروں سے کچلا ہوا ہے۔ اس سے پوچھو کبھی تو نے آرام

---

[۱] گئودان ص ۵۷۲

کے درشن کیے ہیں۔ کبھی تو چھاؤں میں بیٹھا ہے ؛ اس پر یہ ذلّت !
اور وہ اب بھی جیتا ہے ، نامرد، لالچی ، کمینہ ! اس کا سارا اعتقاد
جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا، گویا ٹکڑے ٹکڑے
ہو گیا ہو۔"[1]

یہ حادثہ ہوری کو توڑ دیتا ہے پھر وہ زیادہ دنوں نہیں چل پاتا۔ اس طرح کہنے کو ایک کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن ہوری کی طرح اس کے کروڑوں ساتھی اِس کہانی کو دہرانے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

گئودان کا اختتام ہوری کے ایسے انجام سے ہوتا ہے جس نے اس دور کی دیہی زندگی کی سماجی بنیادوں کے کھوکھلے پن کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ بعض شریف النفس سماجی فلاح و بہبود کی خاطر کچھ باتوں کی ابتدا کرتے ہیں۔ وہ باتیں وقت کی ضرورتوں اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ سارا سماج بخوشی ان کو اپنا لیتا ہے۔ اس طرح مذہبی اور سماجی، رسوم اور روایات ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ صاحبِ اقتدار اور انسانی برادری کے ذمّہ دار افراد کے خلوص میں کمی آجاتی ہے۔ وہ اپنے مفادات کو عزیز رکھتے ہوئے ان رسوم اور روایات کے ذریعے ذاتی منفعت کے راستے تلاش کر لیتے ہیں اور دوسروں کو اپنا دست نگر بننے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ گئودان معنوی رعایت سے اس کی بہترین مثال ہے۔ دیہی علاقوں میں گائے کی اہمیت کے پیشِ نظر گئو کا دان بلاشبہ ایک بہترین سماجی فلاح کا کام ہو سکتا ہے لیکن جو نظیر گئودان میں ملتی ہے اسے تو انسانی زندگی کا المیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ناول کا اختتام فردِ واحد کا المیہ نہیں بلکہ ملک کے دیہی علاقوں میں رہنے بسنے والے کروڑوں محنت کش کسانوں کا ہے۔ ہوری تو محض ان میں سے ایک ہے جو اپنی تمام تر

---

[1] گئودان ص ۵۸۵

مفلسی اور محرومیوں کے باوجود زندگی بھر گائے پالنے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور بالآخر حالات و حادثات کا شکار ہو کر ٹوٹ جاتا ہے۔ پنڈت اس کی نجات کے لیے گئو کو دان کرنے کی تلقین کرتا ہے جب کہ اس کا کل اثاثہ چند ٹکوں پر منحصر ہے۔ وہ شخص جو ساری زندگی گائے کے لیے ترستا رہا ہو اور گائے کا ارمان من ہی میں "لیے دنیا سے چل بسا ہو اس کے لیے بھی گئو کی "دکھشنا" لازمی قرار دی جائے تو اس سے بڑھ کر انسانی زندگی کا المیہ، کیا ہو سکتا ہے۔

ملک میں رہنے بسنے والے کروڑوں کسانوں کی زندگیاں ایسے المیوں سے بھری پڑی ہیں:

> "کسان زندگی بھر محنت کرتا ہے لیکن اس کی محنت کا پھل اسے نہیں ملتا۔ زمیندار بھی اس پر ظلم کرتا ہے اور پولیس بھی اس کے ساتھ زیادتی کرتی ہے۔ وہ حق پر ہوتا ہے لیکن کوئی اس کی داد رسی نہیں کرتا اور کسان کی زندگی اسی المیہ پر ختم ہو جاتی ہے۔"[1]

پریم چند ان حالات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ زمینداروں اور سماج کے ذمہ داروں کے طور طریق کو سمجھتے تھے اور اس بات سے آگاہ تھے کہ کسان کی زندگی:

> "زمیندار کو لگان، ساہوکار کو سود، برہمن کو دچھنا، برادری کو تاوان اور تھانیدار کو رشوت دینے میں گذر جاتی ہے۔"[2]

ان کی آرزوئیں تشنہ رہتی ہیں۔ انھیں نہ تو ذہنی اور جسمانی سکون ملتا ہے اور نہ ہی پوری طرح ان کے پیٹ کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خود غرض عناصر، جن کی گرفت عوام پر مضبوط ہے بھولے بھالے عوام کی کمزوری اور اندھی عقیدت مندی سے فائدہ اٹھا کر اپنے

---

[1] آج کا اردو ادب ص ۱۸۷۔ [2] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۴۴۴

مفادات کے حصول کی خاطر ان کا جارحانہ استحصال کرتے ہیں۔ ہوری کا کردار اس کا واضح ترجمان ہے۔ انھوں نے گئو دان میں ایک فرد کو لے کر کہانی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پورا معاشرہ اس ایک فرد کے اندر سمٹ آتا ہے اور وہ فرد پورے معاشرے کو منعکس کرتا ہے۔ ناول کا ابتدائی تاثر محدود اور اس کا محور ہوری کا کنبہ معلوم دیتا ہے۔ کہانی اس ایک خاندان کے گرد منڈلاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور رفتہ رفتہ احساس دلاتی ہے کہ پریم چند نے اِس ایک خاندان کے سہارے پورے دیہی طبقہ کی زندگی بیان کر دی ہے۔ انسانوں کے بیچ تفریق اور امیر و غریب کی اس شدید کشمکش کو عُریاں کر دیا ہے جو سالہا سال سے ان کے درمیان چلی آ رہی تھی۔

ڈاکٹر قمر رئیس ہوری کے تعلق سے تحریر فرماتے ہیں:

> "پریم چند نے ہوری جیسے ادنیٰ اور عام کسان کو ناول کا ہیرو بنا کر اور اس کے کردار کا مکمل نشو و نما دکھا کر ہندوستان کے افسانوی ادب میں ایک نئی روایت کی بنا رکھی ہے۔ اس کا کردار اردو ادب کے عظیم اور امر کرداروں میں سے ایک ہے۔ وہ نہ صرف اپنے طبقہ کے سماجی مسائل کا نمائندہ ہے بلکہ ہم اس کے کردار میں جاگیردارانہ نظامِ زندگی میں پرورش پائے ہوئے کسانوں کی نفسیات کے سارے پیچ و خم کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔"[1]

ممتاز حسین کا اپنا نظریہ ہے کہ:

> "وہ ہوری کو صرف ایک فریادی اور مظلوم کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کی حالت دیکھ کر انسانیت بیدار ہو اور دانشور طبقہ اس کے مقصد کی حمایت کرے۔"[2]

---

[1] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۴۵۴

[2] ادب اور شعور، ص ۲۶۹

بہرحال پریم چند نے ہوری کے خدوخال ڈھالنے میں مختلف رنگ و روپ کے تمام نقش و نگار اس طرح شامل کیے ہیں کہ اس دور کے کسان کی اصل صورت آنکھوں میں اتر آتی ہے۔ مروّجہ نظام کے نتیجہ میں جارحانہ استحصال کا شکار ایک ایسا کسان سامنے ہوتا ہے جس کی محنت کی بدولت دوسروں کو اناج میسّر آتا ہے اور وہ دانے دانے کے لیے محتاج رہتا ہے، جس کے بیگار سے دوسروں کی حویلیاں تعمیر ہوتی ہیں لیکن ان کی اپنی رہائش چوپال سے بھی بدتر ہوتی ہے جس کی مشقت کی کمائی اس کے اپنے کام نہ آکر دوسروں کو کمخواب مہیا کرتی ہے اور خود تن ڈھانکنے کے لیے چیتھڑوں کو ترستا ہے۔ جو دوسروں کے آڑے وقتوں میں کام آتا ہے لیکن اس کے اپنے مقدر میں بس محرومیاں ہوں۔ ایسے کسان کا نام ہوری ہے جو اس دور کے ایک عام کسان کی علامت ہے۔

"ہم اپنے سماج کے زخموں اور ناسوروں سے ، اپنی جہالت اور گندگی سے منہ چھپاکر بیٹھنا چاہتے ہیں مگر پریم چند ہماری خلوتوں اور پناہ گاہوں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچوکے لگاتے ہیں ـــــ اور مردانہ وار یہ بتاتے ہیں کہ دیکھو یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں ۔"

پروفیسر آل احمد سرور

شاہکار تخلیق ـــــ "کفن"

پریم چند کا ہمارے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔ ان کے افسانوں کا محور دیہات ہے۔ وہ شاید پہلے ہندوستانی ادیب ہیں:

"جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ سے عوام کے مسائل سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔"[1]

اور اس لحاظ سے آخری بھی کہ جن فضاؤں میں انھوں نے اپنے افسانوں کو جنم دیا پھر کسی دوسرے ادیب نے اس جانب اتنی توجہ نہ دی۔ ہر زمانے کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ پریم چند کے عہد کے دیہاتوں میں اور آج کے دیہاتوں میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ مسائل اس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں مگر آج ان کی نوعیت اور تقاضے بدلے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود جدید حالات میں پریم چند کی تخلیقات کی اہمیت برقرار ہے۔ ہمارا افسانوی ادب جب کسی دوسرے پریم چند کی جستجو کرتا ہے تو پریم چند ہی اوّل اور آخر دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے ایک افسانہ نگار اور ادیب کی حیثیت سے ایک مکمل ہندوستانی کے فرائض انجام دیے ہیں اور "سماج کے سب سے درماندہ طبقہ پر غیر منصفانہ طبقاتی جبر کو تسلیم نہ کرنے کے لیے ساری زندگی بھر جدوجہد کی" ہے۔[2]

---

[1] ترقی پسند ادب۔ سردار جعفری۔ ص ۱۳۹

[2] شانتی کے جوتن۔ پریم چند۔ امرت رائے ص ۴۸

پریم چند نہ صرف" مختصر افسانے کے بانی ہیں بلکہ حقیقت نگاری کی ابتدا بھی اردو افسانوں میں انھیں کے ہاتھوں ہوئی ہے[1]"۔ اور" مختصر افسانہ میں کردار نگاری کو رواج دینے میں اوّلیت کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے[2]"۔ انھوں بے شمار افسانے لکھے لیکن جامعہ ، دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں شایع ہونے والا ان کا افسانہ"کفن" ان کے افسانوی سفر میں آخری عہد کی یادگار، افسانوں میں سب سے کامیاب تخلیق اور فنّی چابکدستی کا اعلیٰ مظہر ہے:

"پریم چند نے اردو میں مختصر افسانہ کی روح کو سمجھتے ہوئے اس کے تکنیکی لوازم کو پہلی مرتبہ مروج اور مقبول ہی نہ کیا بلکہ 'کفن' ایسے سنگ میل کی حیثیت اختیار کر جانے والے افسانے سمیت لاتعداد افسانوں میں افراد کے باہمی عمل اور ردِّ عمل کے لیے دیہاتی زندگی، اس کے گوناگوں مسائل اور ان سے وابستہ تلخیوں کو پس منظر بناکر جو طرح ڈالی وہ اب ایک باقاعدہ روایت کی صورت اختیار کر چکی ہے[3]"۔

"عشق دنیا وحبِ وطن" سے لے کر"کفن" تک ان کی مسافت میں افسانہ نگاری کی روایت کی مکمل تاریخ پوشیدہ ہے :

"اس حد تک مکمل کہ افسانہ جہاں سے شروع ہوا اور فن کے مختلف مدارج اور مرحلے طے کرکے جہاں تک پہنچا اس کی ساری اہم کڑیاں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں مل جاتی ہیں[4]"۔

اس طرح اردو افسانہ کی تاریخ میں افسانہ کفن سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں :

---

[1] تنقیدی تجربے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ص ۳۱۴ - ۳۱۵

[2] مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ ، ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر ، ص ۱۶۶

[3] افسانہ حقیقت سے علامت تک ، سلیم اختر ، ص ۱۸۱

[4] داستان سے افسانے تک ، وقار عظیم ، ص ۲۵۹

"میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں۔ اس میں ایک لفظ بھی بے کار نہیں، ایک نقش بھی دھندلا نہیں، شروع سے آخر تک چستی اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔"[1]

شمس الرحمٰن فاروقی رقمطراز ہیں کہ:

"میں کفن کو بے تکلف دنیا کے افسانوں کے سامنے رکھ سکتا ہوں۔ —— یہ افسانہ (اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ) BLACK HUMORY کا شاہ کار نمونہ ہے اور اردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز کرتا ہے۔"[2]

'کفن' کی کہانی بظاہر روزمرّہ کے واقعات سے دور لیکن اس کے حقائق سے بے حد قریب ہے:

"اس میں ایسے دو دیہاتیوں کو افسانہ کا موضوع بنایا گیا ہے جن کے متعلق چند سال پہلے تک یہ تصور بھی ذہن میں لانا محال تھا کہ وہ زندگی میں اتنے اہم ہو سکتے ہیں کہ ان کے گرد کسی غیر فانی کہانی کا حلقہ بنایا جا سکے۔"[3]

کہانی کا مرکزی خیال وہ استحصال ہے جو برسہا برس طبقہ وارانہ تقسیم اور جاگیردارانہ نظام میں کمزور طبقے کے ساتھ روا رکھا گیا اور جس کے نتیجہ میں ایسے لوگ وجود میں آئے جن کے افعال و اعمال سے گھن محسوس ہوتی، جن کی ظاہری شکل و صورت، عادات و اطوار قابلِ نفرین معلوم ہوتے۔ بدترین حالات کے شکار، یہ مجبور لوگ غلاموں کی سی زندگی بسر کرتے اور اچھوت یا شودر کہلاتے، جن کے سائے سے بھی لوگ پرہیز کرتے۔ وہ نہ تو مقدس کتابوں کو چھو

---

[1] تنقیدی اشارے۔ ص ۴۰۔ ۴۱

[2] پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو (امکان، بمبئی ۱۹۸۰ء) ص ۱۷۵

[3] داستان سے افسانے تک۔ ص ۲۲۴

سکتے اور نہ مندروں میں جا سکتے۔ تعلیم کا سوال تو ان کے لیے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پینے کا پانی بھی ایک مسئلہ ہوتا۔ ہر بستی کے باہر ایک کنواں ان کے لیے مخصوص ہوتا۔ مادی اور معاشی ترقی کے تمام راستے ان کے لیے مسدود تھے۔ دو وقت کی روٹی صحیح معنوں میں ان کو میسر نہ ہوتی۔ گھر کے سارے افراد کی محنت پر پیٹ بھرتا تو تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہ ہوتا۔ کپڑا میسر ہوا تو پیٹ خالی رہتا۔ ان کی اپنی نہ کوئی زمین ہوتی اور نہ کھیت۔ سال بھر بیگار کرتے۔ فصل پر اتنا دیا جاتا کہ مشکل سے گزر ہو پاتا۔ دعوتوں کا جھوٹن انھیں کھانے کو ملتا۔ سالہا سال جانوروں کی طرح انھیں برتا اور اتنا کچلا گیا کہ ان میں زندہ رہنے کی جدوجہد کا جذبہ ہی ختم ہو گیا۔ اس طبقہ کا یہ احساس کہ محنت کا صلہ ملتا نہیں تو پھر وہ محنت کس کے لیے کریں، عجب بے بسی میں مبتلا کرنے والا تھا۔ اس پس منظر میں وہ طبقہ نفسیاتی گتھیوں کا شکار ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں نسلاً بعد نسلٍ شودروں میں ایسے افراد ابھر کر سامنے آئے جن کو پریم چند نے اپنے افسانہ کفن میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر" دیہاتی سماج کی نہایت بھیانک مگر سچی تصویر کشی کی ہے[1]"

تین حصوں پر مشتمل افسانہ کفن کا محور ہندوستان کا ایک روایتی گاؤں ہے۔ وہاں کی بیشتر آبادی مزدوروں اور کسانوں کی ہے۔ افسانہ کے پہلے حصے میں رات کا وقت ہے۔ ایک جھونپڑے سے بدھیا کی دل خراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ باہر دروازے پر گھیسو اور مادھو بجھے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں۔ ذات کے چمار، ان لوگوں کی زندگی غربت اور افلاس سے پُر ہے۔ گھیسو، مادھو کا باپ اور بدھیا، مادھو کی جوان بیوی ہے۔ باپ بیٹے انتہائی کام چور اور کاہل ہیں۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آلو، مٹر یا

---

[1] پریم چند قومی یکجہتی کے علمبردار، خواجہ احمد عباس (امکان، بمبئی، جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء) ص ۱۵۹۔

گنّے وغیرہ چرالاتے یا پھر کسی درخت سے لکڑی کاٹ کرلے آتے اور اپنا کام چلاتے۔ محنت و مزدوری سے کتراتے۔ بہو کے آنے کے بعد، دونوں اور بھی حرام خور ہو جاتے ہیں۔ بدھیا ان سے مختلف ہے۔ وہ جفاکش اور مخلص ہے۔ محنت و مزدوری کر کے ان کا پیٹ بھرتی ہے لیکن ایک سال بعد، جب وہ دردزہ سے پچھاڑیں کھاتی ہے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ وہ اندر جا کر اس کو دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے ہیں الاؤ کے نزدیک بیٹھے، بھنے ہوئے گرم گرم آلو نکال نکال کھاتے، پانی پیتے اور وہیں پڑ کر سو جاتے ہیں۔ افسانہ کے دوسرے حصہ میں رات، صبح میں ڈھل کر اور زندگی موت سے ہمکنار ہو کر سامنے آتی ہے۔ مادھو اندر جاتا تو بدھیا کو مرا پاتا ہے۔ وہ بھاگ کر گھیسو کو خبر کرتا ہے۔ دونوں مل کر ایسی آہ وزاری کرتے کہ پڑوسی سن کر دوڑے آتے اور "رسمِ قدیم کے مطابق" ان کی تشفی کرتے ہیں لیکن کریاکرم کی فکر، انھیں زیادہ رونے دھونے سے باز رکھتی ہے۔ دونوں پہلے زمیندار کے پاس پہنچتے ہیں۔ اپنی بپتی جھوٹ کے سہارے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر زمیندار ان کو دو روپے دے دیتا ہے۔ پھر دونوں زمیندار کا حوالہ دے کر، دیگر آبادی سے بھی تھوڑا تھوڑا وصول کرتے ہیں۔ اس طرح "ایک گھنٹے میں" ان کے پاس "پانچ روپئے کی معقول رقم جمع" ہو جاتی ہے۔ افسانہ کے تیسرے حصہ میں دونوں کفن خریدنے بازار جاتے ہیں۔ گھومتے پھرتے شراب خانہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دہاں وہ خوب پیتے ہیں اور لذیذ کھانوں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ سارا روپیہ اڑا دیتے ہیں۔ بدمست ہو کر ناچتے گاتے ہیں اور مدہوش ہو جاتے ہیں۔

کفن میں مرکزی کرداروں کے مکالمے، افسانہ نگار کے وضاحتی بیانات اور جا بجا بکھرے ہوئے سانحی نشیب و فراز افسانہ کے لہجہ کو طنز کا ایسا آہنگ

دیتے ہیں کہ تمام تشکیلی عناصر اس میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں اور افسانہ ایک مکمل طنز کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی ابتدا سے ہی رنج والم میں ڈوبا ہوا، غم واندوہ اور اداسی سے رچی بسی فضا میں پروان چڑھتا ہوا انجام کو پہنچتا ہے۔ یہی فضا افسانہ کے آہنگ سے شیر وشکر ہو کر اس کی تیزی اور تندی کو اور بڑھا دیتی ہے۔ تلخ نفسیاتی حقیقت اور پُر پیچ شخصیت پر مشتمل مذکورہ افسانہ میں مرکزی کرداروں کی گفتگو خاصی معنویت رکھتی ہے۔ پریم چند نے ان مکالموں کے سہارے افسانہ کو مختلف فنی منازل سے گزار کر انجام تک پہنچایا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی باہمی باتوں کے درمیان افسانہ نگار کی مہیا کردہ تفصیلات نے افسانہ کو جیتی جاگتی دنیا سے ہم آہنگ کر دیا۔ کرداروں کا مکمل تعارف، سماجی پس منظر اور محرکات وعوامل کہ جنھوں نے اس کے نشو ونما میں حصہ لیا ہے اور دیگر جزئیات، مکالموں کے درمیان اس طرح سموگئے ہیں کہ ان کے قول وفعل کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور قاری خود کو ایک حقیقی لیکن کلفتوں سے بھر پور جہاں میں سفر کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

افسانے کے ابتدائی جملے فنی اعتبار سے خاصے اہم ہیں۔ پریم چند نے ان جملوں سے کئی معرکے سر کیے ہیں۔ اس کے مرکزی کرداروں، ان سے متعلق جزئیات اور پس منظر کو سریت کے عنصر میں ڈبو کر اس طرح متعارف کرایا ہے کہ پڑھنے والے کی پوری توجہ آئندہ آنے والے واقعات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ پوری دل جمعی سے افسانہ پڑھنے کے لیے خود کو تیار پاتا ہے اور انجام جاننے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ افسانہ کے تمہیدی جملے میں باپ اور بیٹے کو ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے بتایا گیا ہے:

"جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ
کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔"

ڈاکٹر محمد حسن ۔۔۔ کر زنامے کے مطالعہ ۔

"یہ بجھا ہوا الاؤ گویا وہ پورا سماجی نظام ہے جس کے اندر اب کوئی
نئی چنگاری کوئی نوائے سینہ تاب باقی نہیں۔ جو اپنے امکانات ختم
کر چکا ہے اور اب شخصیتوں کو کچلنے والا بوجھ بن چکا ہے۔" [1]

افسانہ نگار اگلے جملے میں بتاتا ہے کہ جاڑوں کی رات ہے۔ فضا سناٹے میں غرق ہے۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا ہے۔ اس جملے کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں کہ:

"گویا دو افراد اور ان کے سامنے کا یہ الاؤ پوری کائنات سے کٹا ہوا
ایک تنہا منظر ہے جن کے سارے رشتے اور سبھی کڑیاں اور رابطے ٹوٹ
چکے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ٹوٹے ہوئے رابطوں اور رشتوں کے
منظر نامے میں باپ اور بیٹے ہی کا رشتہ باقی ہے جو انسانی استحصال کے
نسلاً بعد نسلٍ چلے آتے ہوئے سلسلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ
سلسلہ اس بچے تک پھیلتا نظر آتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور جس
کی پیدائش ماں کو دردِ زہ میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔" [2]

تمہید کے بعد گھیسو اور مادھو کی ابتدائی گفتگو صورتِ حال کی سنگینی میں اضافہ کرتی ہے اور قاری کے ذہن اور اعصاب کو متاثر کرتی ہے۔ اس جگہ کرداروں کا تفصیلی تعارف خاصا اہم ہے۔ افسانہ نگار اس تعارف کے سہارے افسانہ کے پس منظر کو ابھارتا ہے، اس کے ماحول کو دھرتی کی فضا سے ہمکنار کرتا ہے۔ مجموعی تاثر کے لیے راہیں بناتا سنوارتا ہے اور قاری کے ذہن کو پیش آیند واقعات کے لیے ہموار کرتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی اگلی گفتگو اور قلبی واردات سے واقف ہو کر قاری شدید ذہنی صدمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کو ان کی حرکات و سکنات غیر فطری معلوم دیتی ہیں۔ وہ خوف اور دہشت کے

---

[1] پریم چند۔ زمانہ، ذہن اور آرٹ، محمد حسن (آج کل، پریم چند نمبر۔ اگست ۱۹۸۰ء) ص ۸

احساس تلے دب جاتا ہے۔ بھو اندر لب دم ہوتی ہے باہر ان کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ بات چیت میں مگن، مزے سے آلو کھاتے اور پیٹ بھرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال قاری کے ذہن کو کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کا یقین افسانہ کی صداقت پر متزلزل ہو جاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ سماجی نا انصافیوں کا ذکر شروع کر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح استحصال کے نتیجہ میں منفی ردِ عمل کے طور پر ان کرداروں کا وجود عمل میں آیا ہے۔ ان کا یہ احساس کہ کام کرنے سے بھی ان کے لیے بہتری کی کوئی صورت نکلنی ممکن نہیں تو پھر آخر وہ محنت و مشقت کیوں کریں جب کہ فارغ البالی ان کے لیے ہے"جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے" ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سماجی شکنجہ:

> "جو انھیں کچل کچل کر حیوان بنا چکا ہے آخر ان کے توڑے ٹوٹ تو نہیں سکتا۔ اس شکنجے کی گرفت ایسی سخت اور اس کے پنجے اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اس سے نکلنا گویا فولاد کی دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے اور راستہ صرف یہ ہے کہ اس سے چرا کر دو سانسیں سکھ چین کی لے لی جائیں۔" [۱]

ان کے لیے اتنی ہی تسکین کافی ہے"کہ اگر وہ خستہ حال" ہیں تو کم از کم انھیں "کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی" اور ان کی "سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔" ان کے اس طرزِ فکر، احساسات، لگاتار فاقے، تہی دستی اور مجبوری نے ان کو اس مقام تک پہنچا کر اس طرزِ عمل کے لیے مجبور بنایا ہے۔ افسانہ نگار نے پہلی بار ان کے اعمال و افعال کے لیے جواز فراہم کیا ہے۔ وہ گھٹے ہوئے ماحول سے قاری کو نجات دلانے

---

[۱] پریم چند۔ زمانہ، ذہن اور آرٹ، ص ۸

کے لیے گھیسو کی زبانی بارات کی داستان سنا کر خوشگوار یادوں کی ایک بستی آباد کرتا ہے اور قاری کو وہاں پہنچا کر اس کے لیے راحت کے چند عارضی لمحے مہیا کرتا ہے۔ ٹھاکر کی برات کے ذکر نے کہانی کی آہستہ روی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ماضی کے طلسم سے قاری باہر نکلتا ہے تو دونوں پانی پی کر وہیں سو چکے ہوتے ہیں :

" جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں "

دونوں کا " دو بڑے اژدر " کی طرح بے فکری سے سو جانا ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے اور دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے۔ یہ دونوں افراد اسی سماج کے پیدا کردہ ہیں :

" جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی "

اور جن کو آبادی سے پرے، باڑوں میں جانوروں کی طرح زندگی گذارنے کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا تعلیم سے بے بہرہ، فاقوں کے مارے، ہر طرح سے مجبور، بے کس اور لاچار، کچھ کر سکنے کے قابل کیسے اور کس طرح ہوتے۔ دردِ زہ میں وہ کیوں کر مددگار ہو سکتے۔ بے بسی کی انتہا مستقبل سے ان بے نیازوں کو فرار کا راستہ دکھلاتی اور وہ پڑ کر وہیں سو جاتے ہیں۔

افسانہ نگار اگلے حصہ میں بدھیا کی موت کی خبر سناتا ہے۔ کہانی کے سارے تانے بانے اسی عورت کے گرد بنے گئے ہیں جب کہ اس کا عملی وجود کہیں نظر نہیں آتا، صرف اس کی دل خراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ افسانہ کی ابتدا میں کش مکش اور اس کے نتیجہ میں اعصابی تناؤ کا آغاز جن چیخوں سے ہوتا ہے انجام کار اس کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ بدھیا کی بے کس موت قاری کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیتی ہے :

" صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی

تھی۔ اس کے منھ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر
ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ
میں بچہ مر گیا تھا۔"

بدھیا افسانہ کا اہم ترین کردار ہے۔ اس کی موت کے بعد بھی، اس کا تعلق بدستور افسانہ سے قائم رہتا ہے اور اس تعلق سے تمام تشکیلی عناصر سرگرم رہتے ہیں۔ بدھیا کی موت نے دونوں کرداروں کو متحرک کر دیا ہے۔ اس کی زندگی میں صرف باتیں بنانے والے اس کے مرنے کے بعد اتنے چاق و چوبند ہو جاتے ہیں کہ ایک گھنٹہ کے اندر پانچ روپے کی رقم چندہ سے جمع کر لیتے ہیں۔

سریت کا عنصر افسانہ میں ابتدا ہی سے تجسس کو بیدار رکھتا ہے لیکن آخری حصہ میں اس کا غلبہ اس حد تک ہوتا کہ قاری افسانہ کے ہر آنے والے لمحہ کو جاننے کے لیے بیتاب رہتا ہے افسانہ کے اس حصہ کا مکمل انحصار باپ بیٹے کے مکالموں پر ہوتا ہے۔ ان مکالموں کے وسیلہ سے افسانہ تیز رفتاری سے تمام مراحل طے کرتا ہوا انجام کو پہنچتا ہے اور کرداروں کی تہہ دار شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ پریم چند نے اس موقع پر ان کرداروں کے ذریعہ سماج کے عقائد، توہمات اور رسم و رواج پر بڑے معنی خیز انداز میں کاری ضرب لگائی ہے اور اس پورے معاشرے پر طنز کیا ہے جو ان کی خستہ حالی کا اصل ذمہ دار ہے۔ گھیسو کے لفظوں میں :

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے
مرنے پر نیا کپھن چاہیے —— یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے
—— کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

دونوں کفن نہ خرید کر رسم و رواج کو موضوع سخن بناتے ہیں، اس پر لعن طعن کرتے ہیں۔ کفن کی اہمیت کم کرنے کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پیسے آجاتے تو دنیاوی قدروں کو پامال کرکے اپنی خواہشات کی تکمیل کی

سوچتے ہیں ۔ دونوں باپ بیٹے بازار پہنچ کر اِدھر اُدھر گھومتے ہیں یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے ۔ اس مقام پر حساس قاری کا ذہن سوچنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ گاؤں کے بازار میں ایسی کون سی جگہیں تھیں جہاں دونوں افراد گھومتے رہے یا وہ بازار کس قدر وسیع تھا کہ گھومنے پھرنے میں شام ہوگئی ۔ لیکن افسانہ کی اگلی سطور قاری کے ذہن کو فوراً ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں ۔" دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانہ کے سامنے" آپہنچتے ہیں ۔ خاموشی سے اندر داخل ہو جاتے ہیں ۔ گھیسو ایک بوتل شراب اور کچھ گزک خریدتا ہے اور دونوں پینے بیٹھ جاتے ہیں ۔ شراب ان کو سرور میں لے آتی تو گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے ۔ آدھی بوتل ختم ہو جاتی تو کھانے کا سامان منگا لیتے ہیں ۔

"دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو ۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر ۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔"

افسانہ نگار نے اس سے پہلے بھی ابتدا میں ان دونوں کے تعلق سے بہت کچھ بتایا ہے :

" کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی ۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی ۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی ۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں ۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے ، دنیا کی فکروں سے آزاد ، قرض سے لدے ہوئے ۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں ۔"

پریم چند نے ان افراد کو افسانہ میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر وقت کے اہم ترین مسئلہ کی جانب قاری کو متوجہ کیا ہے اور ایک نقیب کے فرائض انجام دیے ہیں ۔ ان دونوں کی کردار سازی چند سالوں کا نتیجہ نہیں بلکہ صدہا صدیوں کی مرہونِ منت ہے ۔ نسلاً بعد نسلٍ ان کا موجودہ وجود عمل میں آیا ہے ۔ ان کی

تشکیل اس سماج نے کی ہے جو دنیاوی اخلاق وضابطوں سے پوری طرح بندھی ہوئی ہے اور اعلیٰ قدروں کی آڑ میں ہر طرح کا ظلم ان پر روا رکھتی ہے۔ پھر ان اصولوں اور قدروں کا ان پر اطلاق کہاں تک مناسب ہوسکتا ہے اور ان کی شخصیت کو پرکھنے کا معیار وہ ضابطے کیوں کر اور کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس دنیا نے جو کچھ بھی انھیں دیا ہے اس کے نتیجہ میں انھوں نے اپنی الگ دنیا بسائی ہے۔ جہاں ان کے اپنے ضابطے اور اصول ہیں۔ جس پر وہ مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہتے ہیں :

"گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور
مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔
بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔"

بہت سے رموز اس وقت آشکارا ہوتے ہیں جب نشہ ان پر غالب آکر، ان کی ظاہری شخصیت کو تہ و بالا کر دیتا اور ان پر چڑھے ہوئے غلاف کو اتار پھینکتا ہے۔ تہہ دار شخصیتوں میں پنہاں نفسیاتی گرہیں کھُل کر ان کے مکالموں کے ذریعہ سامنے آجاتی ہیں۔ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کو زیرِ بحث لاتے ہیں اور اس سماج پر طنز کرتے ہیں جو بظاہر ان کی دل جوئی کرتا اور ان پر رحم دکھاتا ہے۔ اس کے اظہار کے لیے مالی امداد کرتا ہے لیکن یہ رحم کبھی مذہبی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے، کبھی ظاہری شان وشوکت دکھانے کے لیے اور کبھی سماجی و اخلاقی قدروں کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے گو کہ یہی لوگ اس زنجیر کی کڑی ہوتے ہیں جس کے شکنجہ میں جکڑ کر اس طبقہ کا استحصال کیا گیا ہے۔ زمیندار تو ان کا اعلیٰ ترین نمائندہ ہوتا ہے مگر وہ بھی دونوں باپ بیٹے کی امداد کے لیے مجبور ہے کیوں کہ اس کو سماج کے اندر اپنی برتری برقرار رکھنی ہے :

"زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر
رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں، چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر

میں رکھ سڑا، یوں تو بلانے سے کبھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد
کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش، مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں
تھا۔ طوعاً وکرہاً دو روپئے نکال کر پھینک دیے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی
منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔"

افسانہ کا تناؤ اور کلائمکس اس وقت اپنے انتہائی نقطے پر پہنچتا ہے جب وہ کفن نہ خرید کر ساری رقم شراب وکباب پر اڑا دیتے ہیں اور بدمستی کی حالت میں سماجی قانونوں اور مذہبی و اخلاقی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں، اس کے کھوکھلے پن پر طنز کرتے ہیں، اس کی منافقت اور مصلحت پسندی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا اگر شراب انھیں مغلوب نہ کر لیتی۔ وہ بدمست ہو کر ناچتے گاتے، ہوش وحواس کھو کر گر پڑتے اور پڑے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح افسانہ اپنے انجام کو پہنچ کر قاری کو حیرتوں کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیتا ہے جہاں وہ بے کراں سناٹے اور تنہائی میں خود کو گھرا پاتا ہے اور اس کا ذہن تاریخ کے اس انسانی المیہ میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

"کفن" کا ابتدائی مطالعہ ہمیں خوف اور دہشت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسانیت وشرافت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ محبت ومروت کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے۔ باپ اور بیٹے پیٹ بھرنے کی فکر میں نظر آتے ہیں جب کہ بہو قریب المرگ ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں ہمیں گھیسو اور مادھو سے نفرت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لوگ بدھیا کی تکلیف کو دور کرنے کا کوئی جتن نہیں کرتے اس لیے کہ وہ فطری طور پر "کاہل، حرام خور اور بد اطوار" ہیں:

"گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ
گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا — گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے
لیے کام کرنے کی قسم تھی۔"

ان کی آرام طلبی اور بے حسی اس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب بدھیا، مادھو

کی بیوی بن کر ان کے گھر آجاتی ہے۔ وہ دن رات محنت کرتی ہے، ان کا پیٹ پالتی ہے۔ دونوں باپ بیٹے بیٹھے کی روٹی کھاتے اور اکڑ دکھاتے ہیں۔ سبھی سے ان کا رویہ رعونت آمیز رہتا ہے :

"جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔"

ان برائیوں کے علاوہ ان میں انسانی ہمدردی کے جذبے کا فقدان بھی نظر آتا ہے۔ بدھیا جیسی قریب ترین عزیز کے دکھ درد سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتے اور نہ اس کی بے کراں اذیت میں اندر جاکر دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ دونوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ایک کی غیر موجودگی میں دوسرا سارے آلو چیٹ نہ کر جائے ــــ لیکن افسانہ کا یہ ابتدائی تاثر زیادہ دیر قائم نہیں رہ پاتا ہے۔ معمولی غور و فکر اس تاثر کو زائل کر دیتا ہے۔ دونوں کی باتوں سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مادھو کا ذہنی کرب اور قلبی تکلیف ڈھکی چھپی نہ رہ پاتی۔ مزاج میں رچی بسی بے چارگی اور بے کسی، اسکا "دردناک" لہجہ ظاہر کر دیتا ہے :

"مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔"

بدھیا کی تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے :

"مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

اس پر گذرنے والی ہیجانی کیفیت اور قلبی واردات کہ تنگدستی اور مفلسی میں کفِ افسوس ملنا تو ممکن ہے مگر " دوا دارو " کا بندوبست ممکن نہیں، اس بات سے ظاہر ہو جاتی ہیں :

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔"

ایک طرف کربناک چیخوں کا سامنا ہوتا ہے تو دوسری طرف بھوک کی شدّت کا۔ بھوک مٹانے کا سامان موجود ہوتا ہے لیکن بدھیا کو تکلیف سے نجات دلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔ یوں بھوک کا احساس تمام صعوبتوں پر غالب آجاتا ہے۔ یہ بھوک کا ہی اثر تھا کہ جلتے ہوئے آلو حلق سے اتارتے چلے گئے کیوں کہ :

"کل سے کچھ کھایا نہ تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہونے دیں۔"

افلاس کے زیرِ سایہ پنپنے والی محرومیوں کا اندازہ مادھو کی اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ :

"آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

اس کے باوجود ان کے پیٹ بھرے ہوتے تو وہ کھانے کا بچا ہوا سامان سنبھال کر رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے اور مادھو "پوریوں کا پتّل اٹھا کر ایک بھکاری کو" دے دیتا۔ آخر میں بدھیا کی موت پر اپنے خیالات کا اظہار وہ روتے ہوئے اس طرح کرتا ہے :

"بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔"

اس ایک جملہ میں جس بیچارگی، اپنائیت اور مجبوری کا احساس دم توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ مادھو کے قلبی کرب کا پتہ دیتا ہے۔

گھیسو، مادھو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جہاندیدہ ہے۔ ساٹھ سالوں میں بے شمار زخموں کو جھیل کر وہ دنیاوی آلام کا خاصا تجربہ رکھتا ہے۔ اس کو بھی بدھیا کی تکلیف کا پورا احساس ہے۔ اس کی پنہاں قلبی اذیت اس کی باتوں سے ظاہر ہو جاتی ہے :

"معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا، جا دیکھ تو آ۔"

بدھیا کی تکلیف سے متاثر ہو کر وہ مادھو کو ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے :

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سُکھ بھوگا

اسی کے ساتھ اتنی بے ویہائی ـــــ میری عورت جب مری تھی تو تین
دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔"

گھیسو سماج کے رکھ رکھاؤ سے بخوبی واقف ہے۔ اس کو یہ واقفیت ذاتی تجربوں سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کے نو بچے ہوئے۔ ان مواقع پر اسے جن مراحل سے دوچار ہونا پڑا اس کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ مادھو اپنے ہونے والے بچے کی جانب سے فکرمند ہوتا ہے تو وہ اس کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے :

"سب کچھ آجائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں
دے رہے ہیں وہ تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں
کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

وہ زمانہ کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے ہے۔ انسانوں کی فطرت، مہذب سماج کی ظاہرداری اور کھوکھلے پن کو جانتا ہے۔ اس کا ایسے سماج پر اعتماد جو ان کی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہے، قابلِ توجہ اور باعثِ غور و فکر ہے کیوں کہ یہی اعتماد کسی حد تک ان کے طرزِ عمل کا ذمہ دار بھی ہے :

"تو کیسے جانتا ہے اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے ہیں
ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس
سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے ـــــ وہی لوگ دیں گے جنھوں نے
اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح
آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا۔"

دونوں کا مذہبی قدروں پر یقین کامل ہے۔ مادھو بھگوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "تم انترجامی ہو" اور گھیسو کا یہ کہنا کہ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا" اس بات کی علامت ہے کہ نیکی اور دان پُن کا تصور ان کے یہاں موجود ہے۔ مہذب سماج کے غیر انسانی سلوک نے

ان کو ذہنی کش مکش میں بتلا کر رکھا ہے لیکن ان کے اس یقین کو متزلزل نہیں کر سکا ہے مسلسل حق تلفیاں اور غیر منصفانہ رویہ ان کی فکر پر اثر انداز ہوا ہے :

"ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں تو وہ بھی عام انسانوں کی طرح دنیا کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مادھو بھکاری کو کھانے کا بچا سامان دے دیتا تو گھیسو بھکاری سے کہتا ہے :

"لے جا۔ کھوب کھا اور اسیرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیرباد اُسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

ان کے ذہنوں میں آخرت کا تصور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس اعتبار سے گھیسو کا مادھو کو سمجھانا قابل توجہ ہے :

"کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مُکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔"

گھیسو اور مادھو کے کردار پریم چند کی بے پناہ قوتِ مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ دونوں کرداروں کا وجود مسلسل ناکامی، حقارت، توہین اور تضحیک کا پتہ دیتا ہے۔ یہ دونوں کچلے ہوئے پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو بیزاری، جذباتی بغاوت اور استحصالی اقدار کے تئیں منفی ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے ہیں۔

"کفن" پریم چند کی بڑی کامیاب فنی تخلیق ہے۔ اس میں ان کا مشاہدہ، فکر، تخیل، زبان و بیان اور فنی صلاحیتیں معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی ہیں۔ فلمی تکنیک پر لکھے اس افسانہ کا اندازِ بیان بالکل حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ سارے واقعات از اوّل تا آخر ڈرامائی انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔ افسانہ کے تمام ضروری اجزاء انتہائی سلیقہ سے گتھے ہوئے ہیں۔ زندگی کی کش مکش اور مسائل ابتدا ہی سے سامنے آتے ہیں اور ان کا تذکرہ رفتہ رفتہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور تجسس قائم رہتا ہے۔ تحیّر، خوف، دہشت، رقت اور اسرار کے تمام عناصر اپنے اندر سموئے ہوئے یہ افسانہ اختتام پر اپنا بھرپور اور مکمل تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ تاثر دماغ میں چنگاریاں سی پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ کی تاریک ترین حقیقت پر غور کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ کس طرح سماجی شکنجے میں ایک طبقہ کو دبایا، کچلا اور پیسا گیا کہ ان کی ساری شخصیت ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی اور وہ سماج کے لیے ایک مسئلہ بن گئے۔ اس طویل لرزہ خیز داستان کو پریم چند نے بڑے تمثیلی انداز سے چند سطروں میں قلم بند کیا ہے اور ہندوستانی دیہاتوں میں طبقاتی کش مکش کے استحصال کے نتیجہ میں پھیلی افلاس کی کہانی سنا کر وہ وقت کے نازک ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

”پریم چند کا ذہن ارتقاء پذیر تھا۔ ان کا فن حالات
کے ساتھ ترقی کر رہا تھا، ان کے خیالات واقعات
کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے، وہ ہندوستانی عوام
کی روح میں اتر کر ان کے دکھ درد، ان کے کرب و
اضطراب، ان کی مایوسی اور امید، ان کے خوابوں
اور خیالوں — کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ انھیں اس
جال سے نکال کر ایک بہتر زندگی کا خلعت دینا چاہتے
تھے جس میں وہ صدیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔“

سیّد احتشام حسین

افسانہ نگار — پریم چند

پریم چند کے افسانوں کی عہد حاضر میں بھی وہی اہمیت اور افادیت ہے جو پہلے تھی بلکہ ان کی قدر و قیمت میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ پریم چند کا تخلیقی عمل، ان کی فکر اور فن ارتقار کے تدریجی مراحل سے دوچار ہو کر ادبی سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے۔ اسی بنا پر وہ عہد اور اس عہد کا اردو افسانہ جن نشیب و فراز سے گزرتا رہا وہ زیر و بم ان کے افسانوں میں بڑے ہی واضح دکھائی دیتے ہیں اور ان کا افسانوی سفر اردو افسانہ نگاری کی روایت سے عبارت ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کو تاریخ وار سامنے رکھ کر اردو افسانہ کی تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے اور ان کے افسانوں کو الگ کر لینے پر یہی بات ناممکن بن جاتی ہے۔

پریم چند کو اپنے وطن اور اس کے اندر رہنے بسنے والے عام انسانوں سے پیار ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ یہی جذبہ ان کو ادب کی پر پیچ رہ گذر پر لے آیا اور انھوں نے اسے پوری سنجیدگی سے برت کر ملک اور قوم کی خدمت کا وسیلہ بنایا۔ اسی جذبہ نے ان کو اصلاحی و فلاحی نظریات سے ہمکنار کیا۔ یہ نظریات جب ان کے افکار سے لپٹ کر ان کی قوتِ مشاہدہ کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتے تو ان کا نوکِ قلم ایسے فن پاروں کی تشکیل کرتا جن میں اس عہد کے ہندوستان کی بڑی واضح اور حقیقی تصاویر ابھر کر سامنے آجاتیں۔ مختلف کرداروں کے روپ میں ہندوستانی عوام اپنی اصل وضع قطع میں نظر آتے۔ وہ مسائل کہ جن سے

وہ دوچار ہوتے، عُریاں ہوکر انسانی ذہن کو دعوتِ فکر و عمل دے جاتے۔ اسے اردو افسانہ کی خوش بختی کہیئے کہ وہ اپنی ابتدا سے ہی پریم چند کی رفاقت میں زندگی کے حقیقی رنگ و روپ کا مزاج داں اور مختلف کرداروں کی صورت میں اس دور کے عام چلتے پھرتے اصل انسانوں کا مزاج آشنا ہوا۔ پریم چند بہت سے ادبی تجربات سے دوچار ہوئے۔ ان کے افکار پر خارجی و داخلی محرکات اثرانداز ہوتے رہے۔ نظریات میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ ملکی و قومی معاملات، ضروریات اور مفادات ان کے پیشِ نظر رہے۔ بدلتے ہوئے حالات اور ان کے تقاضے ان کے ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہے اور ان کا تخلیقی عمل ان تمام محرکات کے زیر اثر ارتقاء کے تدریجی مراحل سے گذر کر فن پاروں کو ڈھالتا رہا۔ پریم چند کے افسانوں کا بالترتیب تاریخ وار مطالعہ ان تبدیلیوں کی واضح نشان دہی کر دیتا ہے۔

پریم چند اس اعتبار سے بھی اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں کہ انھیں ان کی حب الوطنی ادب کی سنگلاخ وادی میں کھینچ لائی اور وہ تقریباً تمام عمر اسی جذبہ کے زیرِ اثر تخلیقی عمل سے گذرتے رہے۔ ان کا پہلا افسانہ "عشق دنیا و حبِ وطن" اسی جذبہ کا مظہر ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے "سوزِ وطن" کے نام سے ہی ان کی دلی کیفیت اور ذہنی کرب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" بھی اسی تاثر پر مبنی ہے۔ اس افسانہ میں انھوں نے آزادیٔ وطن کی قدر و قیمت بتا کر ہندوستانی عوام کو اس جانب راغب کیا ہے۔ افسانہ کا ہیرو دل فگار میدانِ جنگ میں دم توڑتے ہوئے سپاہی کے سینہ سے نکلا ہوا آخری قطرۂ خون لے کر ملکہ دلفریب کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور اسے ملکہ کی خدمت میں نذر کرتا ہے۔ وہ اس انمول نذرانہ کو محبت اور احترام سے قبول کرلیتی ہے۔ اس موقع پر پریم چند نے اپنے جذبۂ حریت کا اظہار ملکہ دلفریب کی زبانی اس طرح کیا ہے:

"اے عاشقِ جاں نثار! آج سے تو میرا آقا ہے اور میں تیری کنیز ناچیز"

کیوں کہ "وہ قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت

شے ہے۔" [1]

اس مجموعہ کے دوسرے افسانے "شیخ مخمور" میں شہزادہ مسعود، شیخ مخمور کے بھیس میں اپنے سپاہیوں کو خطاب کرتا ہے۔ شہزادہ کی تقریر دراصل پریم چند کے خیالات کی ترجمان ہے:

"ہم نے یہ جنگ توسیعِ سلطنت کے کمینے ارادے سے نہیں چھیڑی۔ تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ کیا تمھارا جوش اتنی جلدی ٹھنڈا ہو گیا؟ کیا تمھاری تیغ انصاف کی پیاس اتنی جلدی بجھ گئی؟ جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہوگی — ہاتھوں میں تیغ مضبوط پکڑو اور نامِ خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ تمھارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمھارا ہے۔" [2]

مذکورہ مجموعہ کا تیسرا افسانہ "یہی میرا وطن ہے"، اندازِ بیان کے اعتبار سے پچھلے دونوں افسانوں سے قدرے جدا ہے مگر موضوع کے لحاظ سے اس افسانہ میں بھی سابقہ جذبات کی کارفرمائیاں ہیں۔ مجموعہ کا پانچواں اور آخری افسانہ "عشقِ دنیا اور حبِ وطن" ہے۔ یہ افسانہ اپنے عنوان سے ہی وطن پرستی کا درس دیتا ہوا معلوم دیتا ہے۔ پریم چند نے اس افسانہ میں ایک علیحدہ روش اختیار کی ہے۔ اس کا خمیر انھوں نے جذبۂ حب الوطنی کو رومان سے ملا کر تیار کیا ہے۔

پریم چند نے اپنی زندگی میں ڈھائی تین [3] سو افسانے مختلف موضوعات

---

[1] "دنیا کا سب سے انمول رتن" ماہنامہ تعمیر، ہریانہ، میرا پہلا افسانہ نمبر (اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰ء) ص ۱۱

[2] "شیخ مخمور" مجموعہ سوزِ وطن، ص ۳۲-۳۳

[3] پریم چند کے افسانوں کی تعداد کے متعلق محققین کے سامنے کئی مسئلے درپیش (بقیہ حاشیہ ص ۹۶ پر)

پر لکھے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افسانوں کا غائر مطالعہ ان کے جذبۂ حب الوطنی سے معمور ایک مشترک زیریں لہر کا سُراغ دیتا ہے جو اُن کی تخلیقات کو ایک مخصوص مزاج سے ہم آہنگ کیے ہوئے ہے۔ ملکی و قومی مسائل کا درد برقِ رَو بن کر تمام عمر ان کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے رہا اور حالات کے مطابق مختلف ادبی ملبوسات میں ظاہر ہوتا رہا۔

پریم چند جنگ آزادی میں سرفروشی کا صحت مند تصور رکھتے ہیں۔ ان کو یہ گوارہ نہیں کہ کسی انگریز کو قتل کر کے راہِ فرار اختیار کی جائے کہ معصوم افراد گرفتار ہو کر ناکردہ گناہ کی سزا پائیں۔ قتل کر کے فرار ہونے والا مجاہد ان کی نظر میں محض قاتل ہے اور کسی توقیر کا مستحق نہیں۔ ان کے اس نظریہ کا واضح اظہار افسانہ "قاتل کی ماں" سے ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں رامیشوری اپنے قاتل بیٹے ونود

(صفحہ ۹۵ کا بقیہ حاشیہ) ہیں۔ اوّل یہ کہ پریم چند نے کل کتنے افسانے لکھے۔ دوم ان میں اردو افسانوں کی تعداد کتنی ہے اور ہندی کہانیاں کس قدر ہیں۔ سوم کتنے افسانے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوئے اور وہ پہلے کس زبان میں لکھے گئے۔ ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی موضوع بحث ہے کہ ترجمہ میں زبان کی نفاست اور لہجہ کی ادائیگی کا کس حد تک خیال رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن نے اپنے تحقیقی مقالہ "پریم چند کی کہانیوں کا سانکھکیہ پریچئے تتھا ورگی کرن" میں ان کے افسانوں کی تعداد ۲۶۸ بتائی ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا "پریم چند ــ فن اور تعمیر" میں پریم چند کے افسانوں کی مجموعی تعداد ۳۰۳ متعین کرتے ہیں حالانکہ انھیں کے اعداد و شمار کے مطابق ان کی اصل تعداد ۲۹۳ ہوتی ہے۔ عبد القوی دسنوی "کتاب نما" کے خصوصی شمارہ میں اور کمل گپت "کہانی کار" کے پریم چند نمبر میں کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ ان کے افسانوں کی اصل تعداد کتنی ہے۔ شیلیش زیدی نے ماہنامہ "آج کل" کے پریم چند نمبر میں جو تفصیل دی ہے اس کے مطابق پریم چند کی کُل کہانیاں ۲۸۸ قرار پاتی ہیں جب کہ نوٹ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ دریافت شدہ مجموعی کہانیوں کی مجموعی تعداد کسی اعتبار سے بھی ۲۸۰ سے زائد نہیں ہو سکتی۔ رام لال نابھوی نے بھی پریم چند کے عہد کے ریکارڈ کو کھنگالا ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے ہیں۔

سے مخاطب ہے :

"میں اسے بخشنا نہیں کہتی کہ مجرم تو منھ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے۔ تم خونی ہو، مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہوگا ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کرلے ورنہ ان بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہوگا۔"[1]

پریم چند کو اوّل اوّل محض غیر ملکی حکمرانی اور اپنی غلامی کا شدّت سے احساس تھا۔ وہ ملک کے اندر پھیلی ہوئی تمام برائیوں کو غلامی کی دین خیال کرتے اور آزادیٔ وطن کا جذبہ ان میں شدّت کے ساتھ بیدار ہو جاتا۔ ان کے ابتدائی افسانوں کا پہلے مجموعہ "سوزِ وطن" کے پانچ میں سے چار[2] افسانے اسی ذہنی فکر کی دین اور اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی نمونے ہیں۔ فنّی خوبیوں سے مبرّا یہ افسانے داستانی ماحول میں رومانی عناصر سے رچے بسے ہیں۔ اِن چاروں افسانوں کا مرکزی خیال وطن پرستی پر مبنی ہے اور یہ چاروں افسانے آزادیٔ وطن کے مبلغ ہیں۔

"سوزِ وطن" کے بعد پریم چند کے افسانے اپنی سابقہ روش سے دور ہوتے گئے۔ ان کا یہ احساس قوی ہوتا گیا کہ جنگ آزادی کے محاذ پر کامیابی سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں جب تک قوم کی کردار سازی اعلیٰ معیار پر نہ کی جائے۔ اسی لیے انھوں نے بعض افسانوں میں ماضی کے مثالی کرداروں کو مرکزی جگہ دے کر عوام النّاس کو تحریک دی کہ وہ ایسے اوصاف سے اپنے کو مزین کریں کہ ان کا قومی کردار بلند اور اخلاقی پستی دور ہو۔ مثالی کرداروں کے ذریعے انھوں نے

---

[1] "قاتل کی ماں"، مجموعہ واردات، ص ۲۰۲۔

[2] "صلۂ ماتم" کو چھوڑ کر بقیہ چار افسانے (دنیا کا سب سے انمول رتن، شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے، اور عشق دنیا اور حبِ وطن)

قوم کی غیرت وحمیت کو جھنجھوڑا اور ان کو آزادی کی قدر وقیمت بتا کر اس کے حصول کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی۔ یہ افسانے پریم چند کے اندر پیدا ہونے والی نظریاتی تبدیلی اور ان کے اصلاحی رجحان کے مظہر اور اصل منزل کی جانب ان کے اٹھتے ہوئے ابتدائی قدم ہیں۔ پہلے وہ محض آزادئ وطن کے جذبے سے سرشار رہے لیکن بعد کے افسانوں میں وہ حصولِ آزادی کے لیے وسائل کے متلاشی ہوئے۔ انھوں نے قوم کی کردار سازی اس معیار پر کرنا چاہی کہ وہ غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کرلے۔ ان کے یہ افسانے بھی فنی اعتبار سے کمزور ہیں۔ انھوں نے ساری توجہ اپنے نصب العین پر مرکوز رکھی ہے۔ ان کی نگاہیں ملک کے اندر پھیلی ہوئی عام برائیوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ اخلاقی پستی، جذبۂ ایثار کا فقدان، طبقاتی کشمکش، ذاتی مفادات پر اجتماعی اغراض کی قربانی، اخلاقی جرأت کی کمی اور سب سے بڑھ کر بے عملی سے پوری قوم گھری ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ:

"غلامی ہی وہ واحد لعنت نہیں ہے جس سے نجات حاصل کرکے پوری قوم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گی اور اس کے تمام دکھ درد کا مداوا ہوجائے گا بلکہ غلامی سے بھی بڑھ کر چند لعنتیں تھیں ___ جو پورے سماج میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے تھیں [1]"

پریم چند نے غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قوم میں خودداری، عزتِ نفس اور جذبۂ ایثار کو اجاگر کرنے کے لیے ماضی کے سنہرے ابواب سے کام لیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے:

"اپنے افسانوں کے ذریعہ ماضی کی عظمت اور اس کی روحانی صفات کی محبت پیدا کی اور وطن پرستی کا سبق سکھایا" [2]

---

[1] ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، ڈاکٹر صادق۔ ص ۱۰۴۔

[2] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ص ۵۶۶

افسانہ "مریادا کی قربان گاہ" میں وہ ماضی کے دریچوں سے ہوکر اس عہد کی تصویر کھینچتے ہیں :

"جب چتوڑ میں میرا بائی تصوف کے متوالوں کو پریم کے پیالے پلاتی تھی۔ رنچھوڑ جی کے مندر میں جس وقت وہ بھگتی سے متوالی ہو کر اپنی سُریلی آواز میں پاکیزہ راگوں کو الاپتی تو سننے والے مست ہو جاتے۔ ہر روز شام کو یہ روحانی سکون اٹھانے کے لیے چتوڑ کے لوگ اس طرح بے قرار ہو کر دوڑتے جیسے دن بھر کی پیاسی گائیں دور سے کسی ندی کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگتی ہیں۔" [1]

قوم میں عزتِ نفس کے احساس کو تیز تر کرنے کے لیے وہ "رانی سارندھا" میں ایک نیم تاریخی واقعہ کا سہارا لے کر ملک کی آزادی اور جذبہ خودداری کا درس دیتے ہیں۔ افسانہ "ستی" میں انھوں نے بندیل کھنڈ کی ایک بہادر خاتون چنتا دیوی کا کردار پیش کیا ہے۔ شادی کی رات اسے یہ خبر ملتی ہے کہ مراٹھے قلعہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اپنے محبوب شوہر رتن سنگھ کو مقابلہ کے لیے بھیجتی ہے لیکن میدانِ جنگ میں اس کی بزدلی دیکھ کر چتا تیار کرنے کا حکم دیتی ہے اور اس سے کہتی ہے :

"تم میرے رتن سنگھ نہیں۔ میرا رتن سنگھ سچا سورما تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے، اپنے اس نکمے جسم کو بچانے کے لیے اپنے چھتری دھرم کو ترک نہ کرسکتا تھا۔ میں جس جواں مرد کے قدموں پر نثار ہو چکی تھی وہ دیوتاؤں کی بہشت میں رونق افروز ہے۔ رتن سنگھ کو بدنام مت کرو۔ وہ بہادر راجپوت تھا، میدانِ جنگ سے بھاگنے والا بزدل نہیں۔" [2]

"وکرما دتیہ کا تیغہ" (ماہنامہ زمانہ، جنوری ۱۹۱۱ء) اور "راجہ ہردول" (زمانہ،

---

[1] "مریادا کی قربان گاہ" مجموعہ پریم چند کے مختصر افسانے، ص ۱۷۳۔

[2] "ستی"، مجموعہ میرے بہترین افسانے، ص ۱۲۱۔

مارچ ۱۹۱۱ء) کے کرداروں کے ذریعے پریم چند نے قوم میں عدل و انصاف، حمیت وغیرت اور شجاعت و بہادری کے وہی اوصاف دیکھنے چاہے ہیں، جو ان کرداروں کی شخصیت کے اہم عناصر قرار دیے جاتے ہیں۔ "سرِ پرُغرور" (زمانہ، اگست ۱۹۱۶ء) کا کنور سجن سنگھ آن کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ "مریادا کی قربان گاہ" کی پربھا چتوڑ کے رانا کی قید میں رہتے ہوئے کہتی ہے کہ:

"وہ دن نہ آئے کہ میں چھتری ونش کا کلنک بنوں! راجپوت قوم نے عزت پر اپنا خون پانی کی طرح بہایا ہے۔ اس کی ہزاروں دیویاں سوکھی لکڑی کی طرح جل مری ہیں۔ ایشور! وہ گھڑی نہ آئے کہ میرے کارن کسی راجپوت کی آنکھیں شرم سے زمین کی طرف جھکیں۔" [1]

پریم چند ان مثالی کرداروں کے ذریعے قوم کے اندر اعلیٰ اخلاقی قدروں کی روح پھونک دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ آزاد ہو کر سربلند رہ سکیں اور رامیندر کی طرح سماجی پابندیوں سے بے پروا ہو کر کہہ سکیں کہ:

"اگر میں برائی کروں یا کوئی ایسا کام کروں جو اخلاقاً قابلِ مذمت ہو تو میں سماج کے فتوے کے سامنے شوق سے سر جھکا دوں گا لیکن سماج کے بے جا ظلم کو برداشت کرنا اخلاقی کمزوری ہے۔" [2]

پہلے افسانوی مجموعہ کے بعد ہی رفتہ رفتہ پریم چند رومانیت اور داستانی طرز سے الگ ہوتے گئے۔ زندگی کے حقائق اور اس مخصوص اور منفرد رنگ کے قریب آتے گئے جس کے لیے وہ آج بھی اردو ادب میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات اور ماحول پر مشتمل افسانے لکھنے شروع کیے لیکن دیہی زندگی کے تعلق سے جو افسانے انھوں نے لکھے وہ کئی اعتبار سے اہم

---

[1] "مریادا کی قربان گاہ"، ص ۱۷۹

[2] "مزارِ الفت" مجموعہ پریم چالیسی حصہ دوم، ص ۱۶۵

اور قابلِ توجہ ہیں۔ وادیٔ ادب کے خارزاروں میں مقصدِ حیات کو سینہ سے لگا کر کود پڑنے والے صاحبِ جنوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ بآسانی اپنے مسلک کو چھوڑ دے گا کہ فن اور اس کے لوازم مقدم ہیں، بہت زیادہ مناسب نہیں۔ اسی لیے ابتداءً ان کے یہ افسانے بھی فنی نقطۂ نظر سے کمزور ہیں۔ پھر بھی زندگی کے حقائق سے قریب اور دیہی معاشرے کی قابلِ قدر تصویریں ہیں جو ذہنِ انسانی پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں اور اردو افسانہ میں حقیقت نگاری کی بنا ڈالتے ہیں۔ پریم چند نے دیہی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے مسائل کو سمجھتے تھے۔ زمینداری نظام، کچلے ہوئے پسماندہ کسان، ہریجن، ذات پات کی تفریق، مروجہ رسوم، تعلیم کی کمی، ان کے تعلق سے پیدا ہونے والے مسائل اور وہ استحصال جو برسہابرس سے طاقتور کمزور کے ساتھ روا کیے ہوئے تھا، یہ سب پریم چند پر عیاں تھے۔ بقول رادھا کرشن ان کے تمام افسانوں کے پیچھے:

"بنیادی خیال یہ تھا دیہاتی زندگی فنا ہوتی جا رہی ہے، سماج لڑکھڑا رہا ہے، غریبی کا سمندر رہمیں نگل رہا ہے اور کسان اپنے عقائد کی بنیاد پر اپنی حالت کو سدھارنا اور اپنے آپ کو خوش حال بنانا چاہتے ہیں[1]۔"

ان موضوعات کے تعلق سے وہ برابر افسانے لکھتے رہے جن میں اس عہد کے ہندوستان کے دیہی معاشرے کی لافانی تصاویر اور کردار نگاری کے بہترین نمونے محفوظ ہیں۔ دیہی معاشرے پر مبنی افسانے اور پریم چند اپنے رنگ و روپ میں ایک دوسرے سے اس طرح منسوب ہوئے کہ دونوں ایک دوسرے کے تعلق سے منفرد ہو کر ممتاز ہوتے گئے اور پریم چند کے یہاں بتدریج تبدیلیاں آتی گئیں۔ وہ رفتہ رفتہ فن اور اس کے لوازم کی جانب بھی جھکتے گئے۔

پریم چند کے عہد میں ملک پر جاگیردارانہ نظام مسلط تھا۔ بیشتر آبادی دیہاتوں پر مشتمل اور ان کی حالت اتنی ابتر تھی کہ آج اس بارے میں کوئی واضح

---

[1] پریم چند کے مختصر افسانے، مرتب رادھا کرشن۔ ص ٦

تصور قائم کرنا دشوار ہے۔ غیر ملکی حکومت اور ان کے اہل کاروں کی نظر میں دیہی عوام کسی بھی توجہ کے مستحق نہ تھے۔ اقتدار محض چند ہاتھوں میں تھا۔ ان کو کھلی چھوٹ تھی اور وہ من مانی کرنے کے لیے آزاد تھے۔ زمین کی ساری ملکیت زمیندار کی تھی۔ وہ یا اس کے کارندے جس کو چاہتے کھیتی کے لیے زمین دیتے یا اس سے بے دخل کر دیتے۔ عام آبادی جو کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل ہوتی ان کی منشاء کے مطابق عمل کرنے پر مجبور تھی ورنہ بصورت دیگر ان کو بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا۔ بظاہر کسی بھی دیہات کا زمیندار غیر ملکی حکومت کا نمائندہ نہ ہو کر بھی پس پردہ ان کا کارندہ ہوتا۔ دیہی زندگی میں زمیندار اور اس کے ہرکاروں کے علاوہ پنڈت اور ساہوکار کی بھی بڑی اہمیت ہوتی۔ اس طرح دیہی معاشرے میں غیر ملکی حکومت کے کارندوں، مذہبی ٹھیکیدار اور مہاجن کی ایسی تثلیث قائم تھی جو پورے معاشرے کا نفسیاتی، تہذیبی، اقتصادی استحصال کرتی۔ برسہا برس سے چلی آنے والی مذہبی رسوم کی ادائیگی پنڈت ہی کے واسطہ سے ہوتی اور مذہب کے تعلق سے وہ سارے امور پر حکم آخر کی حیثیت رکھتا۔ لیکن در پردہ وہ عموماً زمیندار طبقے کے اور اپنے مفادات کو مقدم رکھتا۔ انہی اغراض و مقاصد کے پیش نظر وہ اشلوکوں کی تشریح کرتا۔ پنڈت کی ذمہ داریاں موروثی تھیں۔ مذہب سے عوام کی اندھی عقیدت کا اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ عوام میں توہم پرستی پیدا کی اور ان میں ایسی رسوم کا چلن کیا کہ مذہبی ادارے اور اس کی شخصیت کو روز بروز زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ اس کو مواقع حاصل ہوتے گئے کہ وہ مذہب کی آڑ میں عوام کا زیادہ سے زیادہ استحصال کر سکے۔ ساہوکار حاجت مند کو سود پر نقد و جنس فراہم کرتا۔ عموماً کسان، مزدور اور دیگر لوگ ضرورت پڑنے پر اس سے رجوع کرتے۔ پہلی بار ہی جو اس کے چنگل میں پھنس جاتا تمام عمر نکل نہ پاتا۔ ساری زندگی وہ سود در سود ادا کرتا مگر اصل رقم پھر بھی بنی رہتی۔ اس طرح دیہی معاشرے میں

عموماً زمیندار اور اس کے کارندے، پنڈت اور ساہوکار اپنے اپنے مفاد کے لیے سرگرم رہتے، جو حکمراں طبقہ کا مشترکہ مفاد تھا۔ وہ درپردہ ایک دوسرے سے ساز باز کیے رہتے اور بہ وقت ضرورت ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی ہوتے۔ سرکاری کارندے نہ صرف ان حالات سے چشم پوشی کرتے بلکہ گاؤں کے ان اہم افراد کے اشاروں پر عمل پیرا ہوتے جس کی بنا پر عام لوگوں پر مزید ہیبت طاری رہتی۔ ان حالات نے جس دیہی معاشرے کی تعمیر کی، پریم چند نے اس میں آنکھ کھولی تھی۔ اپنے چہار جانب پھیلی ہوئی مفلسی، بیچارگی اور کس مپرسی دیکھ کر ان کا حساس دل تڑپ اٹھا، ان کے اندر کا فن کار جاگ اٹھا اور بقول رشید احمد صدیقی:

"انھوں نے گاؤں کو اپنا مقصد، اپنا فن اور اپنی زندگی بنا لیا۔"[1]

پریم چند مذکورہ معاشرے کے ایک عام انسان تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے افسانوں میں بھی عام طور سے ایسے افراد کو موضوع بنایا جن کی زندگیاں مشقتوں سے عبارت ہوتیں اور جہدِ مسلسل میں بیت جاتیں:

"پریم چند نے دیہاتی کسانوں کی زندگی میں جدوجہد، عمل، محنت اور فاقہ مستی کو ساتھ ساتھ پیش کیا ہے۔ کسان قرضوں میں زندگی کے دن گذارتا ہے اور قرضوں کی میراث چھوڑ کر مرجاتا ہے۔ اس کا حوصلہ و امنگ خانگی زندگی کی معمولی ضروریات پامال کر دیتی ہیں اور وہ خالقِ رزق ہونے کے باوصف بھوک اور مفلسی کی زندگی بسر کرتا ہے۔"[2]

پریم چند نے زندگی کے آخری لمحوں تک اپنی تحریروں سے ان مجبور، کمزور اور پسماندہ افراد کی بھرپور ترجمانی کی۔ ان کے مسائل سے ملک کی دیگر آبادی کو باخبر کیا اور ان پسے ہوئے افراد کے لیے ہمدردی کی فضا پیدا کی۔ افسانہ "خونِ سفید"

---

[1] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر قمر رئیس (تعارف)، ص ۱۱

[2] پریم چند کہانی کا رہنما، ڈاکٹر جعفر رضا، ص ۲۰۳

میں انھوں نے ان کروڑوں مظلوم انسانوں میں سے محض چند کو اپنا موضوع بنا کر ان کے حالِ زار، دردناک کوائف کو بیان کیا ہے جو برسہا برس سے قرض، بیگار، بھوک اور افلاس کی چکّی میں اس طرح پیسے گئے کہ زندگی کی کسی بہار، کسی بھی سرخوشی کو ان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اور جن کا تعلق زندگی سے گویا بیگانوں کا سا رہ گیا ہو :

"بیساکھ کی وہ جلتی ہوئی دھوپ، آگ کے جھونکے زور زور سے ہرہراتے ہوئے چلتے تھے اور وہاں ہڈیوں کے بے شمار ڈھانچے جن کے بدن پر جامۂ عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا، مٹی کھودنے میں مصروف تھے۔ گویا مرگھٹ تھا جہاں مردے اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے تھے۔" [۱]

اس عہد کا زمیندار خود یا اپنے کارندوں کے ذریعے کسانوں سے جبریہ لگان وصول کرتا۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہوتا کہ کسان کی فصل کیسی ہوئی ہے؟ کمر توڑ محنت کے باوجود کسان اپنے کھیتوں سے کچھ پا سکا یا نہیں۔ اس کو تو بہر حال لگان وصول کرنا ہوتا۔ کسان مجبور تھا کہ وہ اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ کاٹ کر لگان ادا کرے خواہ وہ قرض و بیگار کے کتنے ہی بوجھ تلے دب کر اور بھی بدحال ہو جائے۔ پریم چند نے "پوس کی رات" میں کسان کے اسی المیے کی داستان سنائی ہے۔ کسان باوجود شدید محنت کے اتنا بھی پس انداز نہیں کر پاتا کہ سرما کی طویل راتوں سے اپنے کو محفوظ رکھ کر کھیتوں کی صحیح نگہداشت کر سکے۔ مذکورہ افسانہ کا ہیرو ہلکو شدید سردی سے خود کو محفوظ رکھنے کا امکانی جتن کرتا ہے لیکن پھر بھی صورت بر نہیں آتی :

"جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔" [۲]

---

[۱] "خون سفید"، مجموعہ دیہات کے افسانے، ص ۱۶۷

[۲] "پوس کی رات"، مجموعہ پریم چند کے مختصر افسانے، ص ۱۴۷

اور اپنی بپتا میں گم ہوکر اپنے ماحول سے بے خبر ہوگیا۔ رات کی شدید سردی سے مزید لڑنے کی اس میں سکت نہ رہ گئی تھی۔ یوں اس کی پوری فصل تباہ وبرباد ہوئی لیکن فصل کی تباہی اس کو لگان کی ادائیگی سے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی۔ ورنہ پھر اس کو زمین سے بے دخل ہونا پڑتا۔

زمیندار کے بعد اہم مرتبہ دھرم کے ٹھیکیداروں کا ہوتا۔ یہ برہمن ہوتے جو ساری مذہبی رسوم کی ادائیگی کرتے۔ ان کا یہ سلسلہ موروثی ہوا کرتا۔ پریم چند افسانہ "معصوم بچہ" میں اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ پنڈت چاہتا ہے کہ :

"دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے اور کیوں نہ چاہے جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں گویا انھوں نے خود پیدا کی ہو تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ یہی اس کا ترکہ ہے۔" [۱]

گاؤں کے ذمہ دار پنڈت اس موروثی ترکہ سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ افسانہ 'نجات' میں پریم چند اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے ایک عام کسان کے کوائف کو بیان کرتے ہیں جو علی الصباح نہار منھ پنڈت جی کی بیگار میں لگ جانے کے بعد کہتا ہے کہ :

"زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے۔ یہ اُن سے بھی بڑھ گئے۔"

بغیر کچھ کھائے پیے وہ تمام دن سخت محنت کرتا ہوا دم توڑ دیتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی :

"دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوتے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمات اور اعتقاد کا انعام تھا۔"

---

[۱] "معصوم بچہ" مجموعہ واردات، ص ۲۴۔ ۲۵

ہریجن اور پسماندہ افراد کا مزاج اور دائرۂ فکر، برہمنوں کے حسب منشا اس طرح ہموار ہوا کہ انھوں نے برہمن کی تابعداری کو ہی اپنا مذہب سمجھ لیا۔ ان غریبوں کے انداز فکر کی وضاحت پریم چند نے اپنے افسانہ "دودھ کی قیمت" میں اس طرح کی ہے :

"راجا کا دھرم الگ پرجا کا دھرم الگ ، امیر کا دھرم الگ غریب کا دھرم الگ ، راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں ، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کرلیں، ان کے لئے کوئی قید نہیں، راجا ہیں"[1]

ہریجنوں کی اپنی احساسِ کمتری اور برہمنوں کی مسلّط کی ہوئی ضعیف الاعتقادی نے اپنے شکنجہ میں ان پسماندہ افراد کو اس طرح دابا کہ وہ برہمنوں کے ہر ظلم وستم کو برداشت کرتے ہوئے صابر رہتے۔ پریم چند افسانہ "نجات" میں مظلوم چمار کی سوچ کو یوں ظاہر کرتے ہیں :

"برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے ، گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے، ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں"

افسانہ "سوا سیر گیہوں" میں جب شنکر پنڈت جی سے کہتا ہے کہ میں سوا سیر گیہوں کے بدلے ساڑھے پانچ من گیہوں کہاں سے لاکر دوں ؟ تو پنڈت مہاراج کہتے ہیں کہ یہاں نہ دوگے تو بھگوان کے گھر دوگے۔ شنکر اس جملہ کو سن کر مذہبی امور میں اپنی اندھی عقیدت مندی کی وجہ سے کانپ اٹھتا ہے اور بے بس ہوکر کہتا ہے :

"میں تو دے دوں گا مگر تمھیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا"[2]

پنڈت جی کہتے ہیں :

"وہاں کا ڈر تمھیں ہوگا مجھے کیوں ہونے لگا۔ وہاں تو سب اپنے ہی بھائی

---

[1] "دودھ کی قیمت" مجموعہ پریم چند کے مختصر افسانے ، ص ۱۰۱

[2] "سوا سیر گیہوں" مجموعہ پریم چند کے مختصر افسانے ، ص ۲۳۷

بند ہیں۔ رشی منی سب تو برہمن ہی ہیں، دیوتا برہمن ہیں، جو کچھ بنے بگڑے گی سنبھال لیں گے۔" [1]

شنکر یک مشت اتنا اناج دینے سے قاصر رہتا ہے اور نتیجہ میں پنڈت جی عمر بھر کے لیے اس کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"گلامی سمجھو چاہے مجوری سمجھو، میں اپنے روپے بھرائے بنا تمھیں کبھی نہ چھوڑوں گا۔ تم بھاگوگے تو تمھارا لڑکا بھرے گا۔ ہاں جب کوئی نہ رہے گا تب کی بات تو دوسری ہے۔" [2]

طوعاً و کرہاً شنکر کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا پڑا کیونکہ:

"اس فیصلے کی کہیں اپیل نہ تھی۔ مزدوروں کی ضمانت کون کرتا؟ —— کہیں پناہ نہ تھی، بھاگ کر کہاں جاتا؟ —— اس بدنصیب کو اب اگر کسی خیال سے تسکین ہوتی تھی تو اس سے کہ یہ سب میرے پچھلے جنم کا بھوگ ہے۔" [3]

گاؤں کی زندگی میں تیسری اہم شخصیت ساہوکار کی ہوتی اور یہ بعض اوقات سب پر سبقت لے جاتا۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہوتا کہ جب زمیندار یا پنڈت نے اپنی حاجت روائی اس کے خزانے سے کی ہو۔ اس صورت میں وہ پس پردہ ان پر بھی اثر انداز ہو پاتا۔ وہ عام لوگوں کا مختلف صورتوں میں استحصال کیا کرتا۔ افسانہ "انصاف کی پولیس" میں پریم چند نے دکھایا ہے کہ ایک شخص اس پیشے کو اپنا کر محض چند سکوں سے لاکھوں کا آسامی بن جاتا ہے اور سماج میں سیٹھ، ساہوکار یا مہاجن کہلاتا ہے۔ مہاجن زندگی کے ہر فعل کو نفع و نقصان کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ دان پُن اور دیگر مذہبی امور میں بھی اس کے یہاں لالچ کا دخل ہوتا ہے۔ اقتصادی حقیقت انسانی شخصیت کی تشکیل کس طرح کرتی ہے، یہ افسانہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ افسانہ کا طویل اقتباس

---

[1] "سوا سیر گیہوں" ص ۲۳۷ ، [2] ایضاً ص ۲۴۰ ، [3] ایضاً

اس امر کی واضح نشاندہی کرتا ہے :

"جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا، ایک دھرم شالہ بنوانے کی فکر میں تھے ــــ انھوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا۔ اس کارِ خیر میں ان کی جیب سے ایک کوڑی بھی خرچ نہ ہوگی۔ زمین ایک بیوہ کی تھی ــــ معمار سب ان کے اسامی تھے اور مزدوری کر کے سود ادا کرنا چاہتے تھے۔ اینٹ والا بھی ان سے کئی سال پہلے قرض لے گیا تھا اور اصل کی دو چند رقم ادا کر چکنے کے بعد بھی اس پر ان کے ہزاروں روپئے نکلتے تھے۔ اس لیے یہ مرحلہ بھی طے تھا۔ صرف سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا۔ وہ دس بیس ہزار کی دستاویز لکھالے، بس دھرم شالہ تیار ہے۔"[1]

ہریجنوں کی زندگی کے تلخ حقائق بھی پریم چند نے بڑے موثر انداز میں پیش کیے ہیں۔ برسہا برس کے سماجی، اقتصادی ارتقار کے نتیجے میں ہندوستان میں جو طبقاتی نظام وجود میں آیا، اس نے یہ انتہائی مظلوم اور ستم رسیدہ طبقہ پیدا کیا۔ اس طبقہ یعنی ہریجنوں کے روح فرسا معاشی، معاشرتی اور نظریاتی استحصال کی پریم چند نے کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ ان کا افسانہ "دودھ کی قیمت" اس موضوع کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہے اور ان کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے مذکورہ افسانہ میں دکھایا ہے کہ گاؤں کے زمیندار ٹھاکر مہیش ناتھ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس کی پرورش کی تمام ذمہ داری گودڑ کی بہو بھونگی کے سپرد کی گئی۔ بھونگی نے اپنے لڑکے منگل کو دودھ پلانے کے بجائے ٹھاکر کے لڑکے سُریش کو دودھ پلایا لیکن ایک سال کے بعد ہی بھنگن کا دودھ چھڑا دیا گیا کہ کہیں بچّہ کا دھرم بھرشٹ نہ ہو جائے۔ گودڑ اسی سال پلیگ سے اور پانچ سال بعد بھونگی سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو گئے۔

---

[1] "انصاف کی پولیس"، مجموعہ واردات، ص ۱۵۶ - ۱۵۷

یتیم منگل اپنے کتے "ٹامی" کے ساتھ زمیندار کے یہاں پرورش پاتا رہا۔ کیوں کہ:

"گھر میں اتنی جھوٹن بچتی تھی کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے پل سکتے تھے —— مکان کے سامنے ایک نیم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو مٹی کے سکورے اور ایک دھوتی جو سریش بابو کی اترن تھی۔ جاڑا، گرمی، برسات ہر ایک موسم میں وہ جگہ ایک سی آرام دہ تھی۔" [1]

لیکن ایک دن وہ اس آرام دہ جگہ سے بھی ذلت کے ساتھ نکال دیا گیا تو "ٹامی" نے اس سے کہا کہ:

"اس طرح کی ذلتیں تو زندگی بھر سہنی ہیں —— یوں ہمت ہارو گے تو کیسے کام چلے گا —— مجھے دیکھو نا جب کسی نے ڈنڈا مارا تو چلّا اٹھا۔ پھر ذرا دیر بعد دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ ہم دونوں اسی لیے بنے ہیں بھائی۔" [2]

بالآخر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے وہ پھر اسی جگہ پہنچ گئے اور ضمیر کو کچلتے ہوئے "لات کی ماری ہوئی روٹیاں" کھانے لگے۔ پتّل چاٹنے کے بعد منگل نے ٹامی سے کہا کہ:

"سریش کو اماں نے ہی پالا ہے —— لوگ کہتے ہیں دودھ کی قیمت کوئی نہیں چکا سکتا اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے۔" [3]

پریم چند نے اس جگہ منگل کے سارے ہریجن کی سماجی حیثیت کی وضاحت کی ہے جس نے افسانہ کے ماحول کو اس کی فضا سے ہم آہنگ کر کے موضوع کو مزید پر اثر بنا دیا ہے۔

عہد قدیم سے ہندوستانی سماج میں ہریجنوں کی حالت بڑی قابلِ

---

[1] "دودھ کی قیمت"، مجموعہ پریم چند کے مختصر افسانے۔ ص ۱۰۲

[2] ایضاً ص ۱۰۶ ، [3] ایضاً ص ۱۰۸

رحم رہی ہے۔ ان کے ساتھ اعلیٰ ذات کے لوگ انتہائی شرمناک سلوک کرتے۔ وہ نجس محض خیال کیے جاتے۔ ان کے مقابلہ میں، جانوروں کی اہمیت اور ان کے تقدّس کا اظہار اس موقع پر غیر مناسب ہے مگر یہ لوگ ان سے بھی بدتر خیال کیے جاتے اور ان کی جانوں کی بھی کوئی قدر قیمت نہ ہوتی۔ یہ لوگ انسانی حقوق سے یکسر محروم تھے۔ ان کی اپنی نہ کوئی زمین ہوتی کہ کھیتی کرتے، نہ کوئی ایسی جگہ جہاں اپنی ذاتی رہائش بنا سکتے۔ تمام دن گھر کے سارے افراد سے بیگار لی جاتی اور محنت کا کوئی خاص صلہ انھیں نہ دیا جاتا۔ ان کی عورتوں سے بھی خدمت لی جاتی اور پوری طرح ان کا بھی استحصال کیا جاتا۔ ذات پات کی تفریق اور انسانوں سے غیر انسانی سلوک، پریم چند کیوں کر برداشت کر پاتے۔ انھوں نے اس اہم مسئلہ کی جانب خصوصی توجہ دی۔ وہ افسانہ "صرف ایک آواز" میں ٹھاکر درشن سنگھ کی زبانی کہتے ہیں :

> "جن لوگوں کے سائے سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں، جنھیں ہم نے حیوانوں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے ان سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار، ہمت اور بے نفسی سے کام لینا پڑے گا۔ اُسی ایثار سے جو کرشن میں تھا۔ اس ایثار سے جو رام میں تھا —— ہم مضبوط دل سے عہد کریں کہ آج سے ہم اچھوتوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کریں گے۔ ان کی تقریبوں میں شریک ہوں گے اور اپنی تقریبوں میں انھیں بلائیں گے۔"[1]

ہریجنوں کی حالتِ زار کے علاوہ ہندو سماج میں عورت کے تعلق سے متعدد مسائل معاشرے میں بے شمار تلخیاں پیدا کر رہے تھے۔ سب سے خستہ حالت بیواؤں کی تھی۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سماج میں ان کی حیثیت :

---

[1] "صرف ایک آواز"، مجموعہ پریم پچیسی، ص ۲۴۷ - ۲۴۸

"بڑی قابلِ رحم تھی۔ انھیں معاشرہ کے جسم پر ایک سرطان سمجھا جاتا تھا۔
ان کی نحوست ایسی تھی کہ سہاگنوں کو ان کے سائے سے بچایا جاتا تھا اور
پھر ان کی شادی تو ایک بڑا پاپ تھی۔"[1]

نہ صرف یہ کہ بیواؤں کی زندگی اجیرن تھی بلکہ بعض اوقات سہاگن کی بھی حالت قابلِ رحم ہوتی۔ اسے سماج میں مساوی حقوق حاصل نہ تھے۔ پریم چند نے عورتوں کے ان مسائل کا تذکرہ کر کے سماجی شعور کو جھنجھوڑنا شروع کیا۔ ان کے افسانوں میں عورت کا کردار بلند اور پُر وقار نظر آتا ہے جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ رہتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں :

"پریم چند کے کرداروں میں اگر کہیں جان دکھائی دیتی ہے تو صرف
عورتوں میں۔ ناانصافیوں سے لڑنے کی کسی میں سکت ہے تو عورتوں
میں، یا احتجاج یا سنگھرش کا کوندا لپکتا ہے تو انھیں کرداروں میں، جو
اگرچہ حیاتیاتی طور پر کمزور ہیں، لیکن ان کے اندر کے انسان نے ابھی
دم نہیں توڑا، یا حالات کے جبر نے انھیں پاش پاش نہیں کیا۔"[2]

پریم چند سماج میں عورتوں کے مساوی حقوق کے طلبگار رہے۔ وہ افسانہ "بازیافت" میں لکھتے ہیں کہ :

"عورت محض کھانا پکانے، بچے جننے، شوہر کی خدمت کرنے اور
ایکادشی کا برت رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اس
سے بہت اعلیٰ ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی، ذہنی، عملی ترقیوں میں
برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔"[3]

افسانہ "کسم" بھی ان کے اسی انسانی آزادی اور مساوی حق داری کے خیال

---

[1] آج کا اردو ادب، ص ۱۸۱

[2] افسانہ نگار پریم چند (اردو افسانہ روایت اور مسائل)، ص ۱۷۸

[3] "بازیافت"، تہذیب نسواں (۲۰ اپریل ۱۹۱۸ء)، ص ۲۵۱

کی تائید کرتا ہے :

"مرد سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے کوئی اس سے باز پُرس نہیں کر سکتا ــــ وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے رو رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں، محض تھپیڑے دے سکتی ہے، تو اسے کبھی اس بدمزاجی کی جرأت نہ ہوتی"[۱]

پریم چند نے اپنے افسانہ "بدنصیب ماں" میں عورت کی بے کسی، بے بسی، مجبوری اور لاچاری کو موضوع بنا کر اس حقیقت کو عریاں کیا ہے کہ ہندو سماج میں بیوہ کا حق شوہر کی جائداد سے محض گذارہ لینے کا ہوتا ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد چاروں بیٹوں کا سلوک اپنی ماں کی جانب سے پھر جاتا ہے اور وہ ہر چیز پر قابض ہو جاتے ہیں کیوں کہ افسانہ نگار کے دعویٰ کے مطابق ان کو اس فعل کا حق پہنچتا ہے :

"قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائیداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گذارہ لینے کا ہے"[۲]

نہ صرف یہ کہ ان کا سلوک ماں کے ساتھ خراب ہے بلکہ وہ اخراجات سے بچنے کے لیے اپنی کم سِن بہن کمد کی شادی ایک معمّر آدمی سے کر دیتے ہیں۔ ماں اس حد تک مجبور ہے کہ خاموش تماشائی بنی رہتی ہے اور کمُد کے لیے دیگر کنواری لڑکیوں کی طرح معیارِ شرافت یہی ہے کہ وہ اپنی شادی کے بارے میں کسی طرح کی رائے نہ دے کر خاموش رہے۔ اس طرح ایک معصوم اور کمزور لڑکی اپنے بھائیوں کے حرص کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے :

---

[۱] "کسم"، عصمت، سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء، ص ۱۳۴ - ۱۳۵

[۲] "بدنصیب ماں"، مجموعہ واردات، ص ۵۰

"چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔"[1]

مذکورہ مسائل کے علاوہ یتیم بچّوں، مشترکہ خانداں میں عورتوں کے احوال، تعلیم نسواں اور عام زندگی کے تعلّق سے معاشرے میں پھیلی دیگر برائیوں وخامیوں کو پریم چند نے اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر اتنی سفاکی سے پیش کیا ہے کہ عوام النّاس ان کے بھیانک نتائج سے واقف ہو کر اپنا دائرۂ فکر وعمل تبدیل کرلیں۔

پریم چند کے عہد میں وطنِ عزیز غلام تھا۔ ملکی حالات و مسائل، غیر مستحکم اور تغیر پذیر تھے۔ ملک کی کثیر آبادی اس وقت بھی دیہاتوں پر مشتمل تھی۔ بے جا سماجی و مذہبی رسوم نے گاؤں کے بیشتر مکینوں کو اپنی سنگلاخ باہوں میں جکڑ کر تباہی و بربادی کے اس دہانہ تک پہنچا دیا تھا کہ جہاں وہ غیر انسانی طرزِ زندگی گذارنے کے لیے مجبور تھے۔ ان کی بے بسی و بے کسی ہر معنیٰ میں قابلِ رحم تھی۔ غربت وافلاس میں لپٹی ہوئی ان بے کیف زندگیوں کا تصور بھی آج دشوار ہے۔ غیر ملکی سرکار کے اہل کار، زمیندار و اس کے کارندے، ساہوکار اور مذہبی اجارہ دار ہر طرح ان کا استحصال کرتے۔ متعدد سیاسی تنظیمیں اور مذہبی و سماجی تحریکیں وجود میں آکر ملکی فلاح و بہبود کے لیے مصروفِ عمل تھیں۔ برِ صغیر میں سیاسی و سماجی بیداری کی لہریں دوڑ چلی تھیں۔ پریم چند اس دور کے سانحی نشیب و فراز سے خود بھی دوچار ہوئے تھے۔ ذاتی تجربے اور مشاہدے رفتہ رفتہ ذہن کے مختلف دریچوں سے گذر کر یکجا ہوتے رہے تو ان کے افکار میں تیزی و تندی آتی گئی۔ ان کے مجروح دل و دماغ میں قوم کی تعمیر و اصلاح کا جذبہ شدید ہوتا گیا۔ انھوں نے ان تمام تاثرات کو قبول کیا جو اس عہد کے داخلی و خارجی محرکات اور عوامل کی پیداوار تھے۔ ان کے اس فکری رجحان و فنّی ارتقا کی واضح نشاندہی ان کے افسانوں سے ہوتی ہے۔

---

[1] "بد نصیب ماں" ص ۵۳

انھوں نے وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے افسانوں کے توسط سے ملکی و سماجی مسائل کے لیے راہیں ہموار کی ہیں اور ایک مثالی ہندوستانی کا کردار ادا کیا ہے۔ مستقبل کے خطرات سے قاری کو باخبر کر کے وہ ایک باہوش نقیب کے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

ملک کی خستہ حالی پر اپنے قلبی درد و ذہنی کرب کے زیرِ اثر پریم چند نے ادب کے توسّل سے قوم کی رہنمائی کی ہے۔ لیکن ان کے افسانوں کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی قدر و قیمت اس بنا پر نہیں کہ وہ ایک محترم محبِ وطن ہوئے ہیں۔ ان کے مہکتے ہوئے فن پاروں نے ادبیت کی فلک بوس منزلوں سے گذار کر انھیں مقبول بنایا ہے۔ اس قد آور فن کار نے ہمارے افسانوی ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ افسانہ نگاری کے نہ صرف وہ بانی ہیں بلکہ جدید ادبی تقاضوں سے سنوار کر اس صنفِ ادب کو انھوں نے فن کی بلندی تک پہنچایا ہے۔ یہ ان کی ہی دین ہے کہ افسانہ، خیال و خواب کی وادی سے نکل کر جیتی جاگتی دنیا کی گود میں پروان چڑھتے ہوئے زندگی کے رموز سے آشنا ہوا ہے۔ پریم چند کے اپنے وجود کا خمیر اپنی مقدس دھرتی کی سوندھی مہک سے اتنا رچا بسا رہا ہے کہ افکارِ جمیل کے سنگ تراش نے محض دیسی رنگ و روغن کا استعمال کر کے اپنے نوکِ قلم کی فنکارانہ جنبشوں سے جن فن پاروں کی تخلیق کی ہے وہ معطر ہندوستانی فضاؤں میں ممتاز سے ممتاز تر ہوئے ہیں۔ فن پارے، فن کار سے منسوب ہوئے ہیں تو ایک دوسرے کی پہچان بن گئے ہیں۔

افسانہ نگاری کے بانی پریم چند کے دور میں رومانی عناصر سے مزین داستانوں کا عام رواج تھا۔ ان کے ابتدائی افسانے اسی مروجہ داستانی طرز میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ان میں فارسی الفاظ و تراکیب کی آمیزش کثرت سے نمایاں ہے۔ لیکن پریم چند اپنے ادبی سفر میں کہیں رکے نہیں بلکہ قدم قدم

بڑھتے ہی رہے اور جلد زبان و بیان کی اس پُرخار وادی سے باہر نکل آئے ۔ ابتداءً خیالی کرداروں کی جگہ انھوں نے ماضی کے مثالی کرداروں کو دی ۔ ان کا یہ اٹھتا ہوا پہلا قدم، ان کی ابتدائی منزل ہے ۔ اگلی منزل وہ ہے جب انھوں نے ماضی سے منھ موڑا اور حال کی جانب متوجہ ہو کر عام زندگی سے متعلق افسانے لکھنا شروع کیے ۔ وہ زندگی اور اس کے واسطے سے دیگر جزئیات کو افسانوں کا موضوع بنا کر اپنے معاصرین پر سبقت لے گئے ۔ ان کی زبان میں روز بروز سادگی اور روانی آتی گئی ۔ وہ مروّجہ اندازِ بیان سے دور ہو کر اپنے اسلوب میں نمایاں ہوتے گئے ۔ پریم چند کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں بآسانی لکھا جا سکتا ہے ۔ ان کے آخری دور کے افسانے اتنے آسان اور عام فہم ہیں کہ آج بھی وہ اپنی نظیر آپ ہیں ۔ "روشنی"، "عیدگاہ"، "دودھ کی قیمت"، "علیحدگی"، "نجات"، "وفا کی دیوی"، "پوس کی رات"، "کفن" وغیرہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اپنا ایک روایتی نقش قائم کرتے ہیں ۔

پریم چند کے افسانوں میں فنّی خامیوں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں اور وہ رفتہ رفتہ دور بھی ہوتی رہیں ۔ دراصل ان کا اصلاحی رجحان فن کی راہ میں حائل رہا ہے ۔ انسانی دوستی و اس کی ہمنوائی میں سماج سے براہِ راست تعلق رکھ کر وہ تمام عمر اپنے فرائض کی ادائیگی کرتے رہے ہیں ۔ انھوں نے اوّلاً نظریۂ حیات کو مقدّم و مقدّس جانا اور اسے محرکاتِ فن پر ترجیح دی ہے ۔ لیکن جب کبھی انھوں نے اپنی روش سے گریز برتا ہے تو "کفن"، "پوس کی رات"، "سوا سیر گیہوں"، "مالکن"، "مندر"، "بوڑھی کاکی"، "خونِ سفید"، "مرہم" وغیرہ جیسے افسانے وجود میں آئے ہیں ۔ انھوں نے پہلی بار ایسے لازوال کرداروں کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے

جو اُن کی فنی صلاحیت اور قوتِ مشاہدہ کی سند بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے بیشتر افسانے زندگی کی حقیقتوں کو اتنا اجاگر کر دیتے ہیں کہ آج کا قاری ماضی کے دیہی معاشرے کا شاہد بن جاتا ہے۔

"تاریخ پیدائش سمبت ۱۹۳۷۔ باپ کا نام منشی
عجائب لال، سکونت موضع لمہی ڈھوا، لمہی متصل پانڈے پور،
بنارس۔ ابتداءً ۸ سال تک فارسی پڑھی، پھر انگریزی
شروع کی۔ بنارس کے کالجیٹ اسکول سے انٹرنس
پاس کیا۔ والد کا انتقال ۱۵ سال کی عمر میں ہو گیا۔
والدہ ساتویں سال گذر چکی تھیں، پھر تعلیم کے شعبہ
میں ملازمت کی۔ ۱۹۰۱ء میں لٹریری زندگی شروع
کی۔"

امرت رائے

مختصر سوانحی خاکہ

۱۸۸۰ء ـــــ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے ہے۔ گھر میں پیار سے نواب رائے کہا جاتا تھا۔ یہ نام بڑے باپ کا دیا ہوا تھا۔ ابتدائی تخلیقات ان ہی دونوں ناموں سے ملتی ہیں۔

کایستھوں کے سریواستو گھرانے میں بروز سنیچر ۳۱ جولائی کو ضلع وارانسی کے موضع مڑھوا کے لمہی نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں پانڈے پور سے لگا ہوا وارانسی سے چھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

والد کا نام عجائب لال اور ماں کا نام آنندی دیوی ہے۔ دادا گرُسہائے لال، پٹواری تھے۔

پریم چند سے پہلے تین بہنیں پیدا ہوئیں جن میں پہلی اور دوسری زندہ نہ رہ سکیں۔ تیسری بہن سگّی ان سے سات سال بڑی تھی۔

۱۸۸۵ء ـــــ منشی عجائب لال ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ مشترکہ خاندان کے گذر بسر کا وسیلہ باپ کی تنخواہ کے علاوہ کھیتی باڑی بھی تھا۔ اسی سبب ان کے خاندان کا معیارِ زندگی دوسرے عام کسانوں سے کچھ بہتر تھا۔

دستور کے مطابق پانچ برس کی عمر میں ان کو پڑوسی گاؤں لال پور کے مولوی صاحب اردو اور فارسی کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ یہ گاؤں لمہی سے دو کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

۱۸۸۸ء ــــ آٹھ سال کی عمر میں ان کی والدہ چھ ماہ کی طویل علالت کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں ۔ دادی ان سے بہت ہی پیار کرتی تھیں ۔ وہ ان سے مانوس ہو گئے اور انھوں نے ماں کی مفارقت زیادہ محسوس نہیں کی ۔

۱۸۹۲ء ــــ ان کے والد نے دوسری شادی کرلی ۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کو چاچی کہتے ۔ کچھ ہی عرصہ بعد ان کی دادی کا بھی انتقال ہوگیا۔ ماں کے بعد وہ دادی کی شفقت سے بھی محروم ہوئے توسوتیلی ماں کے سلوک نے ان کو ماں کی محرومی کا احساس دلایا۔ یہ احساس اتنا شدید اور دیر پا تھا کہ اس نے نہ صرف ان کی شخصیت کو بلکہ ان کی فکر اور فن کو بھی متاثر کیا۔

۱۸۹۳ء ــــ بسلسلۂ ملازمت منشی عجائب لال ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوا کرتے تھے ۔ وہ گورکھپور پہنچے اور وہاں انھوں نے پریم چند کا داخلہ مشن اسکول میں چھٹی جماعت میں کرایا۔

۱۸۹۴ء ــــ پریم چند کا گورکھپور میں قیام ایک لحاظ سے خاصا اہم ہے ۔ انھی ایام میں، ان میں ادبی مذاق پیدا ہوا اور انھوں نے متعدد ضخیم داستانیں ، انگریزی ترجمے اور" سیکڑوں ہی ناول پڑھ ڈالے ۔"مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا اور محمد علی ہردوئی نواسی اس وقت کے مقبول ترین ناول نویس تھے ۔" ان کی چیزیں مل جاتیں توختم کرکے ہی دم لیتے ۔

۱۸۹۵ء ــــ گورکھپور میں تین سال رہ کر انھوں نے آٹھواں پاس کیا اور وارانسی کے کوئنس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔
اپنے آبائی گاؤں لمہی میں اپنی نئی ماں کے ساتھ رہتے اور وارانسی روز آتے جاتے۔

۱۸۹۶ء ــــ ان کی شادی ضلع بستی کے موضع رمن پور جو شہر سے ۱۶ کیلومیٹر کی دوری پر ہے، کے ایک معمولی زمیندار گھرانے میں کردی گئی۔ یہ شادی ان کے سوتیلے نانا نے کرائی تھی۔ اِس بیوی سے پریم چند کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔

۱۸۹۷ء ــــ منشی عجائب لال چند ماہ بیمار رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے تو گھر کی تمام ذمہ داریاں ان پر آپڑیں۔ ماں کے علاوہ دو سوتیلے بھائی گلاب اور مہتاب بھی ساتھ تھے۔
بوجہ مفلسی وہ میٹرک کے امتحان میں شریک نہ ہوسکے۔

۱۸۹۸ء ــــ انھوں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔
ایف۔ اے۔ میں ریاضی ایک لازمی مضمون تھا۔ پریم چند ریاضی میں کمزور تھے۔ سفارش کے باوجود ان کا داخلہ کالج میں نہ ہوسکا اور پھر مفلسی بھی دامن گیر تھی۔ ان کا تعلیمی سلسلہ رک گیا۔
گذر بسر کے لیے پریم چند نے پانچ روپیہ کے عوض ایک وکیل کے یہاں بچوں کو پڑھانا شروع کیا اور ملازمت کے متلاشی رہے۔

۱۸۹۹ء ــــ ضلع مرزا پور کے قصبہ چنار کے ایک مشن اسکول میں ان کو اٹھارہ روپیہ ماہوار پر بطور اسسٹنٹ ماسٹر ملازمت مل گئی۔

۱۹۰۰ء ــــ ان کا تقرر کوئنس کالج کے پرنسپل بیکن کی سفارش پر بہرائچ کے گورنمنٹ اسکول میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر بیس روپیہ ماہوار پر ہوگیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد ان کا تبادلہ بہرائچ سے پرتاپ گڈھ کے ضلع اسکول میں فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کی جگہ پر ہوا۔

۱۹۰۱ء ــــ انھوں نے پہلا ناولٹ "ایک ماموں کا رومان" لکھنا شروع کیا۔

۱۹۰۲ء ــــ محکمۂ تعلیم نے ان کو الہ آباد ٹریننگ کے لیے بھیج دیا۔ ٹریننگ کالج کے پرنسپل ان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کا تقرر کالج کے ماڈل اسکول میں بطور صدر مدرس کر دیا۔

۱۹۰۳ء ــــ ناول "اسرارِ معابد" نواب رائے کے نام سے بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار "آوازِ خلق" میں ۸ر اکتوبر سے قسط وار شایع ہونا شروع ہوا۔

۱۹۰۴ء ــــ اپریل میں انھوں نے جونیر انگلش ٹیچر کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔
الہ آباد یونیورسٹی سے اردو اور ہندی کے ورناکیولر امتحان بھی پاس کیے۔
الہ آباد کے دورانِ قیام انھوں نے اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کیا یا

پھر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

ٹریننگ کے بعد پرتاپ گڈھ واپس چلے گئے لیکن چند ماہ کے اندر ہی الہ آباد ٹریننگ کالج کے پرنسپل نے ان کا تبادلہ اپنے یہاں بطور صدر مدرس، ماڈل اسکول میں کرالیا۔

۱۹۰۵ء ـــــ یکم فروری کو "اسرارِ معابد" کی آخری قسط "آوازِ خلق" میں شایع ہوئی۔

"زمانہ" بابت فروری میں انھوں نے دھنپت رائے کے نام سے حکیم برہم کے ناول "کرشن کنور" پر تنقیدی تبصرہ لکھا۔

ماہ اپریل کے "زمانہ" میں "آئین قیصری اور محاربات شمس العلماء ذکاء اللہ" کے عنوان سے ان کا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا۔

مئی میں ان کا تبادلہ الہ آباد سے گورنمنٹ اسکول کانپور ہوگیا۔ کانپور میں پریم چند کا قیام ابتداءً منشی دیا نراین نگم ایڈیٹر "زمانہ" کے مکان پر رہا۔

جون میں دھنپت رائے کے نام سے ایک مضمون بہ عنوان "دیشی اشیاء کو کیوں کر فروغ ہو سکتا ہے"، زمانہ میں شائع ہوا۔

اگست میں نواب رائے کے نام سے زمانہ میں ایک مضمون "سوانح عمری ملکہ معظمہ وکٹوریا" شائع ہوا۔

زمانہ بابت ماہ اکتوبر کے اکبر نمبر میں "راجہ ٹوڈرمل راجہ مان سنگھ" کے نام سے انھوں نے ایک مضمون لکھا اور نومبر دسمبر کے شمارہ میں "آنریبل گوپال کرشن گوکھلے" کی شخصیت پر ان کا ایک اور مضمون شائع ہوا۔

اسی سال ان کی بیوی نے ساس سے جھگڑ کر اور ان سے ناراض ہوکر خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ پریم چند کے ماموں اسے میکے چھوڑ آئے۔

۱۹۰۶ء ــــــ ماموں نے متعدد بار ان سے دوسری شادی کے لیے اصرار کیا۔ بالآخر انھوں نے ضلع فتح پور کے موضع سلیم پور کے منّی دیوی پرشاد کی بیوہ بیٹی شیورانی دیوی جن کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی، سے شیوراتری کے دن شادی کرلی۔ کانپور میں پریم چند کا قیام ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ منشی دیا نراین نگم سے ان کے تعلقات ایسے استوار ہوئے کہ زندگی بھر قائم رہے۔ ان کی دوستی اور قربت کا یہ عالم تھا کہ 'زمانہ' کی ادارت کے بیشتر فرائض پریم چند انجام دیتے۔ بلا ناغہ نوبت رائے نظرؔ، درگا سہائے سرورؔ، پریم چند اور دیگر احباب منشی دیا نراین نگم کے یہاں جمع ہوتے۔ کھل کر مختلف مسائل پر مذاکرے و مباحثے ہوتے، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق ہوتا ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہتا۔

۱۹۰۷ء ــــــ زمانہ، کانپور میں روٹھی رانی کا اردو ترجمہ قسط وار ماہ اپریل سے اگست تک شائع ہوتا رہا۔

ناول "ہم خرما و ہم ثواب" ہندوستانی پریس لکھنؤ نے اور اُس کا ہندی ایڈیشن "پریما" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا۔ ان کا ایک اور ناول 'کشنا' بنارس میڈیکل ہال، پریس سے شائع ہوا۔ یہ تمام تخلیقات نواب رائے کے نام سے منظر عام پر آئیں۔

۱۹۰۸ء ــــــ پریم چند کا پہلا افسانہ 'عشقِ دنیا اور حبِ وطن'، ماہِ اپریل زمانہ، کانپور میں شائع ہوا۔

ماہ مئی میں ایک مختصر مضمون 'صوبہ متحدہ میں ابتدائی تعلیم'، زمانہ میں شائع ہوا۔

جون میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن'، جو کہ پانچ افسانوں پر

مشتمل ہے (۱۔ دنیا کا سب سے انمول رتن ۲۔ شیخ مخمور ۳۔ یہی میرا وطن ہے ۴۔ صلۂ ماتم ۵۔ عشق دنیا اور حبِ وطن)، نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس نے شائع کیا۔

۱۹۰۹ء ـــــــ ۲۴ر جون کو وہ ترقی پاکر سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس ہو گئے اور ضلع ہمیر پور کی تحصیل مہوبہ میں تعینات ہوئے۔ ان کا تعلق ضلع پرشید کے محکمۂ تعلیم سے ہوا تو ان کا بیشتر وقت دیہاتوں کے اسکولوں کا معائنہ کرنے میں گذرا۔ دوبارہ ان کو موقع ملا کہ وہ دیہات کی زندگی قریب سے دیکھ سکیں اور وہاں کے رہنے والوں کے مسائل کو سمجھ سکیں۔ دیہاتی زندگی کی کسمپرسی ایک بار پھر ان کے سامنے تھی۔

۱۹۱۰ء ـــــــ 'سوزِ وطن' کو سرکار نے ممنوع قرار دے دیا اور اس کی جس قدر جلدیں دستیاب تھیں ان کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ ضلع مجسٹریٹ ہمیر پور نے خود ان کو بلا کر فہمائش کی۔ اس وقت تک وہ 'نواب رائے' کے نام سے لکھتے تھے یا پھر 'دھنپت رائے' کا نام استعمال کر لیتے۔ دورانِ ملازمت ان کے لیے یہ دشوار تھا کہ وہ اپنی تخلیقات میں اب ان ناموں کا استعمال کرتے۔ حکومت کے عتاب کا ان کو ہر وقت خطرہ تھا لیکن اس گھٹن نے ان کے اندر باغیانہ تیور پیدا کر دیئے۔ انھوں نے دیا نراین نگم کے مشورہ سے 'پریم چند' کا قلمی نام اختیار کیا اور اِس نام سے ان کا پہلا افسانہ 'بڑے گھر کی بیٹی' ماہ دسمبر کے ماہنامہ زمانہ میں شائع ہوا۔

۱۹۱۱ء ـــــــ پریم چند کی ماں مع اپنے بچوں کے ابھی تک ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ گھر کے مالکانہ حقوق اُن ہی کے ہاتھوں میں ـــــ تھے اور

شیورانی دیوی اپنی ساس کی دست نگر تھیں۔ مہوبہ کے دوران قیام ماں اپنے بھائی کے پاس کانپور چلی گئیں تو شیورانی دیوی نے پہلی بار گھر کی مالکہ کے فرائض انجام دیئے۔ امور خانہ داری کے انتظام کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ پریم چند کو پہلی بار ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرتوں کا اندازہ ہوا اور ایک نئی خوشگوار خانگی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۹۱۲ء —— ناول 'جلوۂ ایثار' نواب رائے کے نام سے انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا۔

۱۹۱۳ء —— ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے کملا رکھا۔

۱۹۱۴ء —— ان کو گاؤں گاؤں مدرسوں کے معائنہ کے لیے لگاتار دورے کرنے پڑتے جس سے روزانہ کے معمولات میں فرق آیا اور ان کا نظامِ ہضم خراب رہنے لگا۔ مسلسل بیماری سے عاجز آکر انھوں نے تبادلے کی درخواست دی۔ 'سوزِ وطن' کی اشاعت کے بعد وہ سامراجی حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے تھے۔ ان کے تبادلے کی درخواست منظور کر لی گئی لیکن سوزِ وطن کا بدلہ ان سے اس طرح لیا گیا کہ ان کو ضلع بستی کے نیپال کی ترائی والے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں مرض نے اور تیزی پکڑ لی۔ مستقل پیچش کی شکایت پیدا ہو گئی۔ علاج کی غرض سے اپنے خسر کے پاس ایک ماہ کی رخصت لے کر الہ آباد پہنچے۔ تعطیل کے خاتمہ پر واپس آگئے لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ تنگ آکر انھوں نے نصف تنخواہ پر چھ ماہ کی چھٹی لی۔ کانپور اور لکھنؤ میں باقاعدگی سے علاج کرایا۔ کافی حد تک فائدہ ہوا۔ رخصت ختم ہونے پر وہ اپنے فرائض منصبی پر واپس پہنچے تو پیچش کی شکایت

پھر پیدا ہوگئی۔ مجبوراً انھوں نے درخواست دے کر بستی کے نارمل اسکول میں بطور اسسٹنٹ ماسٹر اپنے کو تبدیل کرالیا۔ تنخواہ کم ہوئی لیکن ایک جگہ پر قیام سے ان کو آرام میسر ہوا۔

۱۹۱۵ء ــــ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

بارہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'پریم پچیسی' کا حصہ اول زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ (۱۔ ماممتا ۲۔ وکرمادت کا تیغہ ۳۔ بڑے گھر کی بیٹی ۴۔ رانی سارندھا ۵۔ راج ہٹ ۶۔ راجہ ہردول ۷۔ نمک کا داروغہ ۸۔ عالمِ بے عمل ۹۔ گناہ کا اگن کنڈ ۱۰۔ آلھا ۱۱۔ بعد از مرگ ۱۲۔ بے غرض محسن)

انھوں نے ہندی میں پہلی کہانی 'پنچ پرمیشور' لکھی جو 'سرسوتی' میں شائع ہوئی۔

۱۹۱۶ء ــــ بستی کے دورانِ قیام ایف۔ اے۔ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

اگست میں ان کا تبادلہ گورکھپور کے نارمل اسکول میں ہوگیا۔ پریم چند گورکھپور پہنچے تو ان کے بڑے بیٹے دھنّو (شری پت رائے) کی ولادت ہوئی۔ گورکھپور کے دورانِ قیام ان کے تعلقات رگھوپتی سہائے فراقؔ اور مہابیر پرشاد پوت دارسے بڑھے جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہوگئے۔

انھوں نے اپنا ناول "بازارِ حسن" مکمل کرلیا لیکن مناسب پبلشر نہ ملنے کے سبب انھوں نے اس کا ہندی ترجمہ "سیوا سدن" کے نام سے شروع کر دیا۔

۱۹۱۷ء ــــ کہانیوں کے دو ہندی مجموعے "سپت سروج" ہندی

پستک ایجنسی اور " نونِدھ " ہندی گرنتھ رتناکر، بمبئی نے شائع کیا۔

۱۹۱۸ء ــــ ماہ مئی سے انھوں نے اپنا ایک نیا ناول "گوشۂ عافیت" لکھنا شروع کیا۔

ایک اور ترجمہ " مہاتما شیخ سعدی " ہندی پستک ایجنسی نے شائع کیا۔

ان کا افسانوی مجموعہ " پریم پچیسی " حصہ دوم زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا۔ (۱۔ خونِ سفید ۲۔ صرف ایک آواز ۳۔ اندھیر ۴۔ بانکا زمیندار ۵۔ تریا چرتر ۶۔ امرت ۷۔ شکاری راجکماری ۸۔ کرموں کا پھل ۹۔ ساون ۱۰۔ مرہم ۱۱۔ اماوس کی رات ۱۲۔ غیرت کی کٹاری ۱۳۔ منزلِ مقصود)

دسمبر میں " سیوا سدن " ہندی پستک ایجنسی نے شائع کیا اور اس کے معاوضے کی پہلی قسط ان کو چار سو روپیہ ملی۔

۱۹۱۹ء ــــ انھوں نے انگریزی، تاریخ اور فارسی کے مضامین سے بی۔ اے۔ کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

اگست میں ایک اور لڑکا منّو پیدا ہوا۔

ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے ہندی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ " پریم پورنیما " شائع کیا۔

۱۹۲۰ء ــــ ۲۵ر فروری کو گوشۂ عافیت مکمل ہوگیا۔

جولائی میں گیارہ ماہ کا منّو چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے چل بسا۔

" جلوۂ ایثار " کا ترجمہ " وردان " کے نام سے گرنتھ بھنڈار بمبئی نے شائع

کیا۔

افسانوں کا مجموعہ "پریم بتیسی" حصہ اوّل (۱۔ سرِ پُرغرور ۲۔ جگنو کی چمک ۳۔ راجپوت کی بیٹی ۴۔ نگاہ ناز ۵۔ بیٹی کا دھن ۶۔ دھوکا ۷۔ پچھتاوا ۸۔ شعلۂ حسن ۹۔ اناتھ لڑکی ۱۰۔ پنچایت ۱۱۔ سوت ۱۲۔ بانگِ سحر ۱۳۔ مرضِ مبارک ۱۴۔ قربانی ۱۵۔ دفتری ۱۶۔ دو بھائی) زمانہ پریس کانپور اور حصہ دوئم (۱۔ بازیافت ۲۔ بوڑھی کاکی ۳۔ بینک کا دیوالہ ۴۔ زنجیرِ ہوس ۵۔ سوتیلی ماں ۶۔ مشعلِ ہدایت ۷۔ خنجرِ وفا ۸۔ خوابِ پریشاں ۹۔ راہِ خدمت ۱۰۔ حجِ اکبر ۱۱۔ آتمارام ۱۲۔ ایمان کا فیصلہ ۱۳۔ فتح ۱۴۔ درگا کا مندر ۱۵۔ خونِ حرمت ۱۶۔ اصلاح) دارالاشاعت لاہور نے شائع کیے۔

۱۹۲۱ء ——— جنگ آزادی کی تحریک عوامی سطح پر آچکی تھی۔ جلیانوالا باغ کے وقوعہ نے پورے ملک کو غیض و غضب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ۸ر فروری کو گاندھی جی تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گورکھپور پہنچے۔ غازی میاں کے وسیع میدان میں لاکھوں افراد ان کو سننے کے لیے جمع ہوئے۔ پریم چند نے بھی اپنی بیماری کے باوجود اس جلسہ میں شرکت کی اور ان کی تقریر سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ ۱۵ر فروری کو انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اپنی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنے قریبی دوست مہابیر پرشاد پوت دار کی شرکت میں چرخے بنوانے اور ان کے فروخت کا کام شروع کیا لیکن نفع کی کوئی زیادہ اچھی صورت نہ دیکھ کر وہ اپنی بیوی شیورانی دیوی کے مشورہ سے ۱۸ر مارچ کو اپنے آبائی گھر لمہی چلے گئے۔

جولائی میں گنیش شنکر ودیارتھی کے وسیلہ سے کانپور کے مارواڑی ودیالے میں بطور صدر مدرّس ان کا تقرر ہوگیا۔

اگست میں تیسرے بیٹے بنّو (امرت رائے) کی پیدائش ہوئی۔

۱۹۲۲ء ــــ ۱۶ر فروری کو منیجر کاشی ناتھ سے اختلاف رائے کے سبب انھوں کے مارواڑی ودیالے سے استعفیٰ دے دیا اور وارانسی چلے گئے جہاں ان کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر "مریادا" کے مدیر کی حیثیت سے جگہ مل گئی۔ پھر کاشی ودیا پیٹھ میں اسکول کے شعبہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔
ان کے اردو ناول "گوشۂ عافیت" کا ہندی ترجمہ "پریم آشرم" کو ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے شائع کیا۔
"بازارِ حسن" تصنیف کے پانچ سال بعد دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔
یکم اکتوبر سے انھوں نے اپنا ضخیم ناول "چوگانِ ہستی" لکھنا شروع کیا۔

۱۹۲۳ء ــــ فراق گورکھپوری اور اپنے ایک عزیز کی شرکت سے وارانسی میں سرسوتی پریس قائم کیا۔
ہندی کہانیوں کے دو مجموعے "پریم پچیسی" ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے اور "پریم پرسون" گنگا پستک مالا لکھنؤ نے شائع کیے۔
ڈرامہ "سنگرام" بھی ہندی پستک ایجنسی گورکھپور سے شائع ہوا۔

۱۹۲۴ء ــــ خسارے کے سبب سرسوتی پریس کے دونوں حصہ دار پریم چند سے علیحدہ ہو گئے۔
۸ر مارچ کو ایک لڑکی پیدا ہوئی اور وہ صرف تین ماہ زندہ رہی۔
۱۰ر اپریل سے انھوں نے "کایا کلپ" لکھنا شروع کیا۔ پریم چند

کا یہ پہلا ناول ہے جسے انھوں نے پہلے ہندی میں لکھا۔
گنگا پُستک مالا لکھنؤ سے ہندی ڈرامہ "کربلا" اور سرسوتی پریس وارانسی سے "من مودک" نام کا ترجمہ شائع ہوا۔

۱۹۲۵ء ـــــ لکھنؤ پہنچ کر دلارے لال بھارگو کے گنگا پستک مالا میں ملازمت کرلی اور تقریباً ایک سال تک نصابی کتب کی تیاری میں مصروف رہے۔
"چوگان ہستی" کا ترجمہ "رنگ بھومی" گنگا پستک مالا لکھنؤ نے شائع کیا۔
نومبر سے "نرملا" ہندی ماہنامہ "چاند" الہ آباد میں قسط وار چھپنا شروع ہوا۔
انھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا ترجمہ "آزاد کتھا" کے نام سے کیا جس کا پہلا حصہ گنگا پستک مالا لکھنؤ نے شائع کیا۔

۱۹۲۶ء ـــــ "آزاد کتھا" کا دوسرا حصہ بھی گنگا پستک مالا لکھنؤ نے شائع کیا۔
"کایاکلپ" سرسوتی پریس وارانسی سے شائع ہوا۔
ہندی کہانیوں کے تین مجموعے "پریم دوادشی"، "پریم پریتما" اور "پریم پرمود" گنگا پستک مالا لکھنؤ سے شائع ہوئے۔
ستمبر میں وہ وارانسی چلے گئے اور سرسوتی پریس کے کام کو دیکھتے رہے۔ اس درمیان انھوں نے ایک ناول "غبن" لکھنا شروع کیا۔
نومبر میں "نرملا" کی آخری قسط ماہنامہ "چاند" میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۷ء — جنوری سے ناول "پرتگیا" ہندی ماہنامہ چاند میں قسط وار چھپنا شروع ہوا جس کی آخری قسط نومبر میں شائع ہوئی۔

"چوگان ہستی" دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔

وہ نولکشور پریس کے مشہور ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے مدیر کی حیثیت سے لکھنؤ واپس آ گئے۔

اسی سال وہ ہندوستانی اکیڈمی کے ممبر ہوئے۔

۱۹۲۸ء — 'مادھوری' کے شمارہ بابت ماہ جنوری میں انھوں نے "موٹے رام شاستری" کے عنوان سے ایک مزاحیہ کہانی لکھی جس پر لکھنؤ کے ایک وید نے 'مادھوری' پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا۔

اردو میں ان کے دو افسانوی مجموعے "خاکِ پروانہ" نگار پریس لکھنؤ سے (۱۔ نادان دوست ۲۔ نغمۂ روح ۳۔ ستیہ گرہ ۴۔ نذرِ آتش ۵۔ بڑے بابو ۶۔ عجیب ہولی ۷۔ دعوت ۸۔ فکرِ دنیا ۹۔ خوش دل ۱۰۔ مانگے کی گھڑی ۱۱۔ تالیف ۱۲۔ کپتان ۱۳۔ ملاپ ۱۴۔ خاکِ پروانہ ۱۵۔ علیحدگی ۱۶۔ مزارِ آتشیں) اور "خواب و خیال" لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور سے (۱۔ نخلِ امید ۲۔ نوک جھونک ۳۔ موٹھ ۴۔ شدھی ۵۔ شطرنج کی بازی ۶۔ عبرت ۷۔ شکست کی فتح ۸۔ دستِ غیب ۹۔ دعوت شیراز ۱۰۔ مایۂ تفریح ۱۱۔ فلسفی کی محبت ۱۲۔ خودی ۱۳۔ لال فیتہ ۱۴۔ استی) شائع ہوئے۔

ہندی میں "پریم چتورتھی" کے نام سے کہانیوں کا ایک مجموعہ سرسوتی پریس وارانسی نے شائع کیا اور "باکمالوں کے درشن" کے نام سے ایک مختصر سوانحی خاکہ رام نراین لال، الہ آباد نے شائع کیا۔

وہ اپنی اکلوتی بیٹی کملا کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۲۹ء ـــــــ 'نرملا' اردو میں تصنیف کے چھ سال بعد گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور سے شائع ہوا۔

بارہ افسانوں کا ایک مجموعہ "فردوس خیال" (۱۔ توبہ ۲۔ عفو ۳۔ مرید ۴۔ نیک بختی کے تازیانے ۵۔ راہِ نجات ۶۔ ڈگری کے روپے ۷۔ نزولِ برق ۸۔ بھاڑے کا ٹٹو ۹۔ بھوت ۱۰۔ سوا سیر گیہوں ۱۱۔ تہذیب کا راز ۱۲۔ لیلیٰ) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد نے شائع کیا۔

کہانیوں کے دو ہندی مجموعے "پانچ پھول" اور "پریم تیرتھ" سرسوتی پریس وارانسی سے شائع ہوئے۔

ایک ترجمہ "رام چرچہ" کے نام سے لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا۔

اسی بیچ انھیں سرکار کے ایک نمائندہ کی جانب سے رائے صاحب کے اعزازی خطاب کی پیش کش کی گئی جس کو انھوں نے ٹھکرا دیا۔

جنوری میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور نے چالیس افسانوں کا ضخیم مجموعہ "پریم چالیسی" دو حصّوں میں شائع کیا۔ (حصہ اوّل ۱۔ منتر ۲۔ کشمکش ۳۔ خانہ برباد ۴۔ کفّارہ ۵۔ ترشول ۶۔ بُھنی ۷۔ داروغہ کی سرگذشت ۸۔ استعفیٰ ۹۔ انتقام ۱۰۔ انسان کا مقدّس فرض ۱۱۔ مندر ۱۲۔ رام لیلا ۱۳۔ دینداری ۱۴۔ چوری ۱۵۔ قربانی ۱۶۔ الزام ۱۷۔ آنسو کی ہولی ۱۸۔ اُمّہا کا جنازہ ۱۹۔ قوم کا خادم ۲۰۔ دیوالی حصہ دوئم ۱۔ دو سکھیاں ۲۔ حرزِ جان ۳۔ ماں ۴۔ مجبوری ۵۔ لیلا ۶۔ مزارِ الفت ۷۔ ابھاگن ۸۔ جہاد ۹۔ دیوی ۱۰۔ حسرت ۱۱۔ چکمہ ۱۲۔ جنت کی دیوی ۱۳۔ عفو ۱۴۔ بند دروازہ ۱۵۔ جلوس ۱۶۔ امتحان ۱۷۔ سزا ۱۸۔ گھاس والی ۱۹۔ بیوی سے شوہر ۲۰۔ پوس کی رات)

مارچ میں انھوں نے سرسوتی پریس سے اپنا ذاتی رسالہ "ہنس"

نکالا اور جب 'مادھوری' سے الگ ہوئے تو پوری توجہ انھوں نے 'ہنس' پر مرکوز کر دی۔ جلد ہی 'ہنس' نے اپنا ایک معیاری مقام بنالیا۔

ہندی کہانیوں کا مجموعہ 'سمر یاترا' سرسوتی پریس وارانسی سے شائع ہوا۔

۱۹۳۱ء ـــــ ۲۲/ اگست کو انھوں نے اپنی ادارت میں 'ہنس' کے ساتھ ہی ایک ہفتہ وار اخبار 'جاگرن' کا اجرا وارانسی سے کیا۔

۱۱/ نومبر کو ان کی اہلیہ شیورانی دیوی کو نمک کا قانون توڑنے پر گرفتار کر لیا گیا اور دو ماہ کی سزا دے دی گئی۔

سرسوتی پریس وارانسی نے "غبن" شائع کیا۔

۱۹۳۲ء ـــــ جنوری میں "پردۂ مجاز" لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا۔

سرسوتی پریس وارانسی سے "کرم بھومی" کی اشاعت ہوئی۔

"گئو دان" لکھنا شروع کیا اور ساہتیہ سبھا کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے پہلی بار دہلی پہنچے۔

۱۹۳۳ء ـــــ فروری میں منیجر کی شرارت سے سرسوتی پریس کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی

مارچ میں انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔

سرسوتی پریس سے ڈرامہ "پریم کی دیوی" اور کہانیوں کا مجموعہ "پریڑاں" شائع ہوا۔ ناول "بیوہ" بھی اسی پریس سے شائع ہوا۔

۱۹۳۴ء — لمبے خسارے کے سبب ماہ مئی میں "جاگرن" بند ہوگیا۔

۳۱ر مئی کو سنے ٹون فلم کمپنی کے ڈائرکٹر ایم۔ بھوانی کی دعوت پر "مل مزدور" کی کہانی لکھنے بمبئی پہنچے تاکہ سرسوتی پریس کو قرض کے بوجھ سے نجات دلاسکیں۔ ۲۲ر جولائی کو شیورانی دیوی کو لینے کے لیے بمبئی سے دلی آئے اور ۲۱ر جولائی کو واپس بمبئی چلے گئے۔

اسی درمیان تیرہ افسانوں پر مشتمل ان کا ایک اور مجموعہ "آخری تحفہ" نراین دت سہگل اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا (۱۔ آخری تحفہ ۲۔ جیل ۳۔ وفا کی دیوی ۴۔ طلوعِ محبت ۵۔ شکار ۶۔ ادیب کی عزت ۷۔ قاتل ۸۔ ستی ۹۔ ڈیمانسٹریشن ۱۰۔ برات ۱۱۔ دو بیل ۱۲۔ آخری حیلہ ۱۳۔ نجات)

۲۸ر دسمبر کو وہ جنوبی ہند کی سیر کرتے ہوئے مدراس پہنچے۔

۱۹۳۵ء — ۲۵ر مارچ کو فلمی دنیا سے بد دل ہو کر وارانسی واپس گئے۔ اکتوبر میں 'ہنس' کو بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے حوالے کر دیا۔ اس کی مشترکہ ادارتی ذمہ داری کنہیالال منشی کے ساتھ مل کر سنبھالی۔

سرسوتی پریس وارانسی سے ہندی کہانیوں کا مجموعہ "مان سرودر" حصہ اوّل شائع ہوا۔

۱۹۳۶ء — 'ہنس' کی ادارتی ذمہ داری بھی بھارتی ساہتیہ پریشد نے لے لی۔

ناول "منگل سوتر" لکھنا شروع کیا اور گئودان کو سرسوتی پریس سے شائع کیا جس کو اردو میں ان کی وفات کے دو سال بعد مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔

پندرہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ "زادِ راہ" حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے

شائع ہوا (۱۔ آشیاں برباد ۲۔ فریب ۳۔ زادِ راہ ۴۔ زیور کا ڈبہ ۵۔ ڈامل کا قیدی ۶۔ نیئور ۷۔ قہرِ خدا ۸۔ بڑے بھائی صاحب ۹۔ لعنت ۱۰۔ مس پدما ۱۱۔ ہولی کی چھٹی ۱۲۔ لاٹری ۱۳۔ وفا کی دیوی ۱۴۔ خانہ داماد ۱۵۔ حقیقت)

۱۰ر اپریل کو لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ لکھنؤ سے لاہور پہنچے۔ 'آریہ پرتی ندِھی سبھا' نے ان کا زبردست استقبال کیا۔

اسی ماہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور اجلاس میں، جہاں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو بھی موجود تھے، شریک ہوئے۔

۱۶ر جون کو اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ کئی بار قے اور خونی دست ہوئے۔

۱۹ر جون کو روسی ادیب میکسیم گورکی کے انتقال پر، بیماری کے باوجود "آج" کے دفتر میں تعزیتی جلسہ میں شرکت کی اور تعزیتی خطبہ بھی لکھا۔

۲۵ر جون سے بیماری نے شدّت اختیار کر لی۔

۲ر اگست کو اپنے بڑے بیٹے شری پت کے ساتھ ایکسرے کرانے لکھنؤ گئے۔

۷ر اکتوبر رات گئے تین بجے تک ہندی کے ادیب جنیندر کمار سے بات کرتے رہے اور صبح ساڑھے سات بجے ۵۶ برس کی عمر میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

"پریم چند کی توجہ زیادہ تر معاشرتی مسائل پر مرکوز رہی اور انھوں نے بالعموم ادنیٰ اور متوسط طبقہ کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب (واردات) کے دیکھنے سے مجھے دو خاص باتیں نظر آئیں۔ زندگی میں بعض مسائل معمے کی صورت رکھتے ہیں جن کی موافقت میں جتنا کہا جا سکتا ہے، اتنا ہی ان کی مخالفت میں۔ مثلاً ایثار اور بقائے ذات کا مسئلہ۔ یا حق اور ناحق کا مسئلہ۔ منشی جی ایسے مسائل اکثر پیش کرتے ہیں اور تصویر کے دونوں رُخ پیش کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔"

ل۔ احمد اکبرآبادی

"واردات" — تجزیاتی مطالعہ

آزادی سے قبل ہندوستانی معاشرے کی صورتِ حال، طبقاتی تفریق، رسم و رواج کے نام پر ظلم و ستم اور اس جیسے بیشتر موضوعات کو اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنی نُدرت کے ذریعے خوبصورت فن پارے اور قدر اوّل کی تخلیق کے طور پر عرصۂ دراز تک کے لیے قائم کر دینے والے اردو کے سب سے اہم افسانہ نگار ہیں پریم چند۔
پریم چند نے اپنے افسانوں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے عملی زندگی میں بھی اس عظیم افسانہ نگار کی وابستگی رہی۔ مسائل کے تعلق سے گہری وابستگی ان کی پیش کش کے عمل کو مزید حُسن، گہرائی اور کشش عطا کرتی ہے۔ اس بات کا تجربہ ہمیں پریم چند کے افسانے پڑھتے ہوئے ہوتا ہے "واردات" اُن کا آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ تیرہ[13] افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کے بیشتر افسانے ہندی میں شائع ہو چکے تھے۔ پریم چند نے انھیں اردو میں منتقل کر کے مجموعہ کی شکل دی، اور اپنی زندگی میں ہی مکتبہ جامعہ، دہلی کے حوالے کر دیا جیسا کہ ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء کو حسام الدین غوری کے نام لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے:

"میری دو کتابیں جامعہ ملیہ، دہلی کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں ایک کا نام 'میدانِ عمل' ہے اور دوسری کا نام 'واردات' ہے۔"

کسی وجہ سے یہ مجموعہ پریم چند کی وفات (۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے بعد ۱۹۳۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ دیا نرائن نگم اپنے رسالہ 'زمانہ' کے پریم چند نمبر میں لکھتے ہیں:

"واردات' تیرہ افسانوں کا مجموعہ ... ... جامعہ ملیہ دہلی سے ۳۷ء میں شائع ہوا۔"

مجموعہ کا پہلا افسانہ "شکوہ شکایت" ہے جو ہندی زبان میں 'گلہ' کے عنوان سے ماہنامہ 'ہنس' اپریل ۱۹۳۲ء میں چھپا۔ یہی افسانہ اردو میں 'شکوہ شکایت' کے عنوان سے ماہنامہ 'جامعہ' جنوری ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ تکنیکی اعتبار سے یہ افسانہ بیانیہ انداز میں ہے۔ جس میں ایک گھریلو خاتون کا اپنے شوہر نامدار کے متعلق یک طرفہ بیان ہے۔ اس بیان میں جہاں ایک جانب اپنے شوہر کی سادہ لوحی اور زمانہ میں مختلف لوگوں سے ان کے انسانی رشتوں اور تعلقات کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے وہیں دوسری جانب معاشرتی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ممتاز شیریں اپنے مضمون "ناول اور افسانہ میں تکنیک کا تنوع" میں لکھتی ہیں کہ :

> "'شکوہ شکایت' بالکل سادہ بیانیہ انداز میں ہے۔ یہاں مصنف 'وہ' میں چھپا ہوا ہے۔ ایک عورت بیان کرتی جا رہی ہے اپنے شوہر کی خامیاں، میٹھی میٹھی شکایتیں۔ اس چھوٹے سے افسانے میں نہ صرف شوہر کے کردار کا خاکہ بڑی کامیابی سے کھینچا گیا ہے بلکہ ایک خوشگوار اور ہموار ازدواجی زندگی کا عکس بھی۔ 'شکوہ شکایت' تکنیک کے اعتبار سے خود کلامیہ Monologue ہے۔" (اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ ص ۴۶)

پریم چند کے اس افسانہ میں جہیز اور کنیا دان سے متعلق مسائل کے حوالے بھی موجود ہیں۔ اور مکالماتی لہجہ میں اس دور کی انسانی فطرت اور نفسیات کے تہہ دار گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے بلکہ بڑی خوبصورتی سے اس نکتہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بیان کا پیرایہ دلنشین اور پُر اثر ہے۔ واقعات کا تسلسل ایسا ہے کہ قاری کو کسی قسم کی الجھن یا بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ آخر میں اپنے شوہر کی تمام برائیوں اور کمیوں کے باوجود اس کے لیے محبت کے جس جذبہ کا اظہار ہوا ہے وہ بھی ایک شوہر پرست بیوی کے جذبات کی عمدہ عکاسی ہے۔ اس طرح تمام شکوہ شکایت ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے توسط سے منشی پریم چند قاری کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔

دوسرا افسانہ 'معصوم بچہ' ہے جو پہلی بار ہندی میں 'بالک' کے عنوان سے 'ہنس' اپریل ۱۹۳۳ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد اس مجموعہ میں 'معصوم بچہ' کے عنوان سے شامل

کیا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار گنگو ہے جو ایک ان پڑھ برہمن ہے مگر اپنے برہمن ہونے کے ناطے، دوسری ذات کے لوگوں سے خود کو افضل سمجھتا ہے۔ کبھی ندی نہانے نہیں جاتا، نہ اُسے میلے ٹھیلوں میں جانے کا شوق ہے وہ ایک سرکاری افسر کا ملازم ہے۔ افسر بھی اسے برہمن سمجھ کر، کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں دیتا جو اس کے لائق نہ ہو البتہ گنگو جب ایک روز اپنے افسر سے استعفیٰ دینے کی بات کرتا ہے تو افسر کو تعجب ہوتا ہے کہ معاملہ کیا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ ودھوا آشرم سے نکالی ہوئی ایک بیوہ گومتی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ افسر اُسے زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ گومتی کی دو تین بار شادی ہو چکی ہے مگر ہر جگہ سے وہ بھاگ آتی ہے۔ گنگو شادی پر تلا بیٹھا ہے اور آخرکار شادی کر لیتا ہے مگر چند دنوں بعد گومتی غائب ہو جاتی ہے گنگو پاگلوں کی طرح اُسے تلاش کرتا ہوا اسپتال پہنچتا ہے جہاں اس نے ایک بچہ کو جنم دیا ہے، گنگو بہت خوش ہوتا ہے اور بڑے پیار سے اُس بچہ کو قبول کر لیتا ہے اور گومتی کے ساتھ واپس گھر آجاتا ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے بڑی خوبصورتی سے 'ودھوا وواہ' کے موضوع کو انسان دوستی کے تانے بانے میں بُنا ہے۔ گومتی بیوہ ہو کر جس محبت کی بھوکی تھی وہ اُسے دوبارہ شادی کرنے میں نہیں ملی تھی اور اس کے سابقہ شوہروں نے اُسے نکال باہر کیا تھا۔ جو اُس سماج کا خاصہ تھا لیکن گنگو نے برہمن ہوتے ہوئے بھی اسے محبت سے اپنایا۔ اس برتاؤ سے وہ اس قدر متاثر تھی کہ پہلے شوہر سے ملے، اپنے پیٹ میں پنپ رہے بچے کو گنگو کے دل ٹوٹ جانے کے خوف سے دور رکھنا چاہتی تھی اِسی لیے وہ گھر سے چلی گئی تھی مگر گنگو نے اُس کی پریشانی کا حل بچے کو اپنا کر نکال لیا اور اِس طرح گومتی اور گنگو کے درمیان ایک مضبوط انسانی رشتہ اس معصوم بچے نے پیدا کر دیا۔ افسانہ کی بُنت بہت خوبی سے واقعات کے گرد کی گئی ہے۔ جس سے ایک خوش آئند تاثر پیدا ہوتا ہے پریم چند نے بیوہ کی شادی اور بچہ کو اپنانے کے مسائل کی پیش کش بھی بہت رومانی انداز میں کی ہے۔

مجموعہ کا تیسرا افسانہ "بدنصیب ماں" ہے جو ہندی میں "بیٹوں والی وِدھوا" کے عنوان سے چھپا تھا۔ 'پھول متی'، اِس افسانہ کا مرکزی کردار ہے وہ پنڈت اجودھیا ناتھ

کی بیوہ ہے۔ اُس کے چار جوان لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکوں کی شادی ہو چکی ہے محض لڑکی (کُمدُ) کی شادی ہونی باقی ہے۔ چاروں بھائی دولت کے لالچ میں بہن کی شادی ایک عمر رسیدہ شخص سے کر دیتے ہیں اور ماں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ دولت کی ہوس اور سماجی ٹھیکیداروں کی بنائی نفرت آمیز فضا میں بیوہ ماں کے بچے بھی اُس کے ساتھ کس قدر ذلّت آمیز برتاؤ روا رکھتے ہیں، اس کی بھرپور عکّاسی پریم چند نے مذکورہ افسانے میں کی ہے یہ بیوہ عورت کا دوسرا روپ ہے۔ ایک روپ جوان بیوہ کا 'معصوم بچہ' میں نظر آتا ہے اور یہ دوسرا روپ بیٹوں والی بیوہ کا ہے۔ ان دونوں شکلوں میں بیوہ عورت کے ساتھ معاشرے میں روا رکھے جانے والے سلوک کا بہت باریک بینی سے مطالعہ نظر آتا ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار پھول متی کے گرد واقعات کا جو تانا بانا پریم چند نے بُنا ہے وہ بہت فطری اور زمانہ کی روش کے عین مطابق ہے۔ اس افسانہ میں ہندو سماج میں موجود دقیانوسی روایات کی بہت ہولناک تصویر اُبھرتی ہے آج حقوق بیوگان سے متعلق نئے قوانین کے نفاذ کے باوجود اس سماج کی صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ عملی زندگی میں آج بھی یہ قوانین بے معنی ہیں۔ مذکورہ افسانہ اِس کربناک صورتِ حال کا نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ قاری کو ایک لمحہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے یہی پریم چند کی افسانہ نگاری کی اہم خصوصیت ہے۔

چوتھا افسانہ 'شانتی' ہے جو پہلے 'سکونِ قلب' کے عنوان سے اردو میں ماہنامہ 'عصمت'، فروری ۱۹۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ پھر شانتی کے عنوان سے ہندی میں شائع ہوا۔ مذکورہ مجموعہ میں یہ افسانہ 'شانتی' کے عنوان سے ہی شامل کیا گیا ہے اس کو اردو سے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت پریم چند نے کچھ تبدیلیاں کی تھیں مثلاً 'سکونِ قلب' میں گوپا کے شوہر کا نام سری ناتھ تھا لیکن شانتی میں یہ نام بدل کر دیو ناتھ کر دیا ہے۔ متن میں بھی بعض تبدیلیاں ہیں۔ اس افسانہ میں پریم چند نے ذہنی اور فکری عدم مناسبت کی بنا پر ازدواجی زندگی میں ابھرنے والے اختلافات کی بڑی چابکدستی سے عکاسی کی ہے اور کس طرح اِس غیر متوازن زندگی میں اچھے خاصے آباد گھر برباد ہو جاتے ہیں، اس کا

تذکرہ کیا ہے۔ افسانہ میں دیوکی ناتھ کی بیوہ گویا اپنی اکلوتی بیٹی سنی (ستیا) کی شادی اپنے شوہر کے دوست مداری لال کے لڑکے کیدار ناتھ سے آپسی تعلقات کی بنا پر کر دیتی ہے اکلوتا بیٹا ہونے کے سبب لاڈ پیار نے کیدار ناتھ کے اندر ایسی انانیت بھر دی ہے کہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں بھی اس پر بند نہیں باندھ پاتیں اور جو اس کے دل میں آتا ہے وہ وہی کرتا ہے۔ سنّی بھی گویا کی اکلوتی اور لاڈ پیار میں پلی بیٹی ہے لیکن اپنی نسوانی انا کی وجہ سے اپنے شوہر کی انانیت کو اپنی ہتک تصور کرتی ہے حالانکہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی بھرپور کوشش کرتی ہے لیکن اس کے نتائج بہتر نہ ہو کر اور بدتر نکلتے ہیں۔ کیدار ناتھ ازدواجی زندگی سے فرار اختیار کر کے ایک ایکٹرس کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ جس سے غمزدہ ہو کر اور اس کی بے مروتی اور بدچلنی سے بددل ہو کر سنّی خودکشی کر لیتی ہے۔ اس طرح اس کو شانتی مل جاتی ہے۔ دراصل پریم چند کے زمانہ تخلیق میں عورتوں کی نسوانی انا اور اس کی خاطر اپنی جان سے گزر جانا ایک وقار کا مسئلہ تھا۔ دوسری جانب مردوں کا بدچلن ہونا اور ازدواجی زندگی سے فرار اختیار کرنا ایک عام رویہ بن گیا تھا کیوں کہ کوئی قانون ایسا نہ تھا جو شادی کے اس بندھن سے دونوں کو الگ کر سکتا۔ آج کے دور میں خواتین کو بہت سے حقوق حاصل ہیں اور انھیں خودکشی کی جگہ قانونی طور پر ایسی تباہ کن ازدواجی زندگی سے نجات مل سکتی ہے۔ بہرحال پریم چند نے جس طرح اس افسانہ کی بُنت کی ہے اور ازدواجی زندگی کے اس ہولناک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے اُس زمانے کے معاشرے کی خرابیوں کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے اور یقیناً یہ منشی جی جیسے افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہی تھیں جن کی بدولت معاشرے کی خرابیوں کی جانب عوام اور سرکار کی توجہ ہوئی تھی اور خواتین کی بہتری کے لیے قوانین بنائے گئے تھے۔

پانچواں افسانہ 'روشنی' ہے یہ مشہور و مقبول افسانہ ماہنامہ 'ادبی دنیا' میں نومبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک آئی۔ سی۔ ایس آفیسر اور ایک دیہاتی بیوہ کو مرکزی کردار بنا کر پریم چند نے ایک غریب بیوہ کی اخلاقی جرأت، جذبہ ایثار اور اعلیٰ انسانی اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔ بیانیہ تکنیک پر مبنی اس افسانہ کا اندازِ بیان

سیدھا سادا، صاف ستھرا اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ افسانہ کی شروعات میں پریم چند اُس آئی۔سی۔ایس۔ افسر کی تعنیاتی اتر پردیش کے ایک کوہستانی علاقے کے سب ڈویژن میں بتاتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں کام کرنے کا، شکار اور فطرت کے مناظر کا ذکر کرتے ہوئے وہ تعلیم کی صورت حال، مدرسوں کو کھاٹ پر بیٹھ کر! ونگھنے اور اسکولوں میں بچوں کی کمی کا احساس دلاتے ہیں اس کے علاوہ بھی وہ مختلف پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ اچانک سرکاری افسر کو گرد کا طوفان گھیر لیتا ہے۔ اسی طوفانی حالت میں افسر تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے پر بھی راستہ نہیں چل پاتا جبکہ ایک عورت سر پر 'کھانچی' رکھے تیز قدموں سے جاتی دکھائی دیتی ہے بادو باراں کے طوفان میں بھی اس کی مردانہ وار چال اور آس پاس کے ماحول سے بے نیازی انھیں حیرت زدہ کر دیتی ہے افسر کے راستہ پوچھنے پر وہ انھیں ڈھارس دے کر آگے چلنے کے لیے کہتی ہے جہاں اس کا گاؤں ہے اور وہاں سے سیدھا راستہ ہے افسر اس کے اس طرح آندھی طوفان میں بے جھجک چلنے پر سوال کرتا ہے تو اسے جواب میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک بیوہ ہے چھوٹے بچے گھر پر ہیں اس لیے اس کا گھر پہنچنا ضروری ہے۔ آئی۔سی۔ایس آفیسر جب گاؤں پہنچتا ہے تو بیوہ اس کی جانب آتی ملتی ہے وہ پریشان تھی کہ مسافر ابھی تک گاؤں کیوں نہیں پہنچا۔ افسر از راہ ہمدردی اس کو پانچ روپیہ دینا چاہتا ہے مگر وہ اُسے قبول نہیں کرتی۔ افسر اپنی منزل کی جانب چلتا ہے راہ میں اولوں کا طوفان اُسے آگھیرتا ہے۔ اسی درمیان ایک اندھا۔ ریٹ سے نالے کے پانی میں گر جاتا ہے افسر کے دل میں کش مکش ہوتی ہے کہ اُسے بچائے یا نہیں پھر انسانیت جیت جاتی ہے۔ افسر خود پانی میں کود کر اُسے بچاتا ہے اور اندھا جب ہوش میں آتا ہے تو افسر سے اس کا تعارف چاہتا ہے جواب ملتا ہے کہ وہ ایک خادم ہے تو اندھا کہتا ہے کہ تمھارے سر پر کسی دیوی کا سایہ ہے:-

"ہاں، ایک دیوی کا سایہ ہے۔"

"وہ کون دیوی ہے؟"

"وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے۔"

"تو کیا وہ عورت ہے؟"

"نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔"

پند و موعظت سے بھرے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے جملے قدیم ہندوستانی تہذیب کو اُجاگر کرتے ہیں۔ دراصل پریم چند مذکورہ افسانہ کے ذریعہ آئی۔ سی۔ ایس آفیسر کے دلی جذبات کا اظہار کر رہے ہیں کہ بیوہ۔ عورت کے عزم، بے خوفی اور انسان دوستی نے انھیں روشنی دکھائی تھی کہ وہ اندھے انسان کو پانی میں ڈوبنے سے بچا سکیں۔ اس طرح انسانی ہمدردی کے احساس کو جگانے والے کردار کو پیش کرکے پریم چند نے افسانہ کو بامقصد بنا دیا ہے۔

چھٹا افسانہ 'مالکن' ہے جو پہلی بار ہندی میں 'سوامنی' کے عنوان سے وشال بھارت ستمبر ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا پھر اس مجموعہ میں اردو زبان میں 'مالکن' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے مذکورہ افسانے میں پریم چند نے ہندوستانی دیہات کے ایک ایسے خاندان کی زندگی کا بڑا خوبصورت منظر پیش کیا ہے۔ جہاں ایک جوان عورت "رام پیاری" بیوہ ہو جاتی ہے تب اس کا سسر اس کو ڈھارس دیتا ہے اور اسے گھر کے بھنڈار کی چابی سپرد کرکے، اپنے مرحوم بیٹے کی جگہ ہل بیل سنبھال لیتا ہے۔ رام پیاری کی چھوٹی بہن رام دلاری اس کے دیور کو بیاہی ہے پیاری مالکن ہونے کے احساس میں گم ہو کر خاندان کے اخراجات چلانے میں منہمک ہو جاتی ہے اور اس میں خود کو اس قدر غرق کر لیتی ہے۔ کہ اس پر طعنے تشنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا ہے:

"گھر کے سبھی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت و سست سنا جاتے تھے اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرے اور کرے وہی جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ داری کے احساس پر طعن و طنز اور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان حملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔ وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتی ہے وہی ہوتا ہے اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔"

اور پھر اسی احساسِ ذمہ داری اور گھر کی عزت بچانے کی بنا پر اس کے اپنے زیورات ایک ایک کر کے گروی ہو جاتے ہیں۔ مہربان سسر سمجھاتا ہے لیکن وہ ان سنی کر دیتی ہے اور سسر، چھوٹی بہن دلاری، دیور متھرا اور اس کے بچوں کی خاطر سب الجھنیں برداشت کرتی ہے انھیں سکھ پہنچانے اور فکروں سے بے نیاز رکھنے میں اپنی جوانی کھو دیتی ہے:

"تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے۔ کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔"

سسر کا انتقال ہو جاتا ہے، دیور کو زیادہ سمجھ بوجھ نہیں۔ حالات بگڑنے لگتے ہیں تو متھرا اپنی بھاوج سے گاؤں چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں کہیں اور جانے کو کہتا ہے۔ پیاری تو ایسا نہیں چاہتی مگر بے بس ہے دُکھی ہو کر بھی وہ گھر کو سنوارنے میں لگی رہتی ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں ایک بیوہ کے ساتھ اس کے سسر کے مشفقانہ برتاؤ کو پیش کر کے عام روایت سے بالکل الگ راستہ اختیار کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک غمزدہ بیوہ کو مالکن کے روپ میں گھر کی بڑی بن کر اپنے مرحوم شوہر کی یادوں کو خاندان کی بہتری کے لیے وقف کرنے کے عمل سے اس کی زندگی سدھر سکتی ہے اسی لیے وہ ایک آدرش بیوہ کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کو بجائے نفرت کے محبت کے ماحول نے جنم دیا ہے۔

ساتواں افسانہ 'نئی بیوی' ہے جو لاہور سے نکلنے والے رسالہ 'افسانہ' کے شمارہ بابت مئی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ہندی میں یہ افسانہ 'نیا ویواہ' کے عنوان سے 'مان سروور' جلد ۲ میں چھپا تھا۔ مذکورہ افسانہ پریم چند کے معاشرے میں دولت مند طبقہ کی سماجی رضامندی سے عیاشی کا ایک سفرنامہ ہے جس میں کسی طرح سیٹھ جی اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دولت کے بل بوتے پر ایک کمسن لڑکی سے شادی رچا لیتے ہیں جبکہ ان کے اور لڑکی کے درمیان نہ صرف جسمانی رشتوں میں فاصلہ ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی اختلاف ہے اس عہد کی اس بھیانک تصویر کو پیش کر کے پریم چند ان رواجوں اور روایتوں کا آپریشن کرتے ہیں جن سے معاشرے میں بدکرداری اور گندگی پیدا ہوتی ہے

جس کی بنا پر بہت سے ذہنی اور جنسی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں لالہ ڈنگامل دولت کمانے اور مجرے سننے کی چاہ میں اپنی وفا شعار بیوی لیلاؔ کی جانب سے اس درجہ لاپرواہی برتتا ہے کہ وہ گھٹ گھٹ کر مرجاتی ہے لیکن دوسری کمسن لڑکی آشا سے شادی کے بعد وہ کس قدر دلچسپی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ اس کی یہ تصویر اُن بے میل رشتوں کے قدرتی انجام کی جانب ڈھکیل دیتی ہے دراصل 'نئی بیوی' کا مقصد اُس نام نہاد سماج کے گھناونے رُخوں سے پردہ اٹھانا ہے جسے بڑی خوبصورتی سے روایتوں اور رواجوں کے پردے میں نہاں رکھا جاتا ہے ۔

مذکورہ دونوں افسانے محض اس وجہ سے اہم نہیں ہیں کہ ان میں عورت کی ازدواجی زندگی کو موضوع بناتے ہوئے نام نہاد سماج کے گھناونے رخوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے یا معاشرے کے سامنے ایک آدرش بیوہ کا روپ پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ افسانے اس لیے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ پریم چند نے عورت کے جنسی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی فطری خواہشوں کو اُجاگر کیا ہے ۔ یہ تحریک انھیں شاید افسانوی مجموعہ "انگارے" سے ملی تھی جس نے فنکار کو بے باکانہ اور آزادانہ تخلیقی اظہار کی ترغیب دی ۔ لہٰذا پریم چند نے بندھے ٹکے اخلاقی اور معاشرتی قوانین سے اوپر اٹھ کر سیکس کے موضوع کو براہ راست اپنایا ۔ 'مالکن' اور 'نئی بیوی' دونوں افسانوں میں پریم چند نے دو مختلف زاویوں سے 'جنس' کے معاملہ کو پیش کیا ہے ۔ 'مالکن' کی رام پیاری بیوہ ہونے کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کا شدّت سے احساس کرتی ہے اور سسر کے مشفقانہ رویہ کی بدولت خود کو گھر کی مالکن سمجھتی ہے ۔ عین جوانی کے عالم میں یہی تصور اس کی خواہشات کو کچل دیتا ہے جب کہ اس کی حقیقی بہن رام دُلاری جو کہ اس سے صرف تین سال چھوٹی ہے ، اپنے شوہر متھرا کے ساتھ بھرپور ازدواجی زندگی گزارتی ہے ۔ لیکن جب دُلاری ، متھرا اور اس کے بچے پیاری کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو تنہائی کے ایام میں ملازم جوکھو اس کا سہارا بنتا ہے اور پھر اس کی چھیڑ چھاڑ کی بدولت دبی ہوئی نسوانی خواہشات سرکشی کی جرأت کرتی ہیں ۔ اس کے برعکس 'نئی بیوی' کی آشا ، رام پیاری کی طرح گھریلو لذتوں سے کبھی بھی آشنا نہیں ہو پاتی ہے بلکہ ہر پل اپنے آپ کو گھٹن کے ماحول

میں محسوس کرتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے فطری طور پر وہ اپنے نوکر جگل کے قریب ہو جاتی ہے، جس کا خود اسے بھی احساس نہیں ہو پاتا۔

مذکورہ دونوں افسانے عورت کی نفسیات کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں تھرڈ پرسن (نوکر) کی آمد عورت کی جنسی خواہشات کی نمائندگی کے طور پر ہوئی ہے۔ جوکھو اور جگل دونوں کے کرداروں کے عمل سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایسے جذباتی اور جنسی لمحات کی ذمہ داری بھی سماجی عمل پر عائد ہوتی ہے۔ کیوں کہ بالآخر 'نئی بیوی' کی آشا اپنے عمر رسیدہ شوہر سے جنسی تشفی حاصل کرنے میں ناکام ہونے پر جگل سے تعلقات استوار کر لیتی ہے تو 'مالکن' کی رام پیاری کو جوکھو سے ایک نئی لذّت آمیز زندگی کی شروعات کا اشارہ ملتا ہے۔ بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن :

"نئی بیوی، اور 'مالکن' میں جذباتی زندگی کم و بیش ایک ہی انداز سے پیش ہوئی ہے۔ دونوں افسانوں میں تیسرے آدمی کے کردار کے عمل سے باتیں کہہ دی گئی ہیں ..... تیسری شخصیت سے انسانی نفسیات کی گرہیں کھلتی ہیں ...... تیسری شخصیت سے ایک نئی لذّت آمیز زندگی کی تخلیق کا اشارہ ملتا ہے۔" (پریم چند کا فن، ص ۴۸-۴۹)

یہ اشارہ واضح طور پر دونوں افسانوں میں ہے خاص طور سے 'مالکن' میں اس وقت جب جوکھو شادی کے مسئلے پر گفتگو کرتا ہے اور رام پیاری اس میں گہری دلچسپی لیتی ہے :

"پیاری کے رخسار پر ہلکا سا رنگ آگیا۔ بولی ! اچھا اور کیا چاہتے ہو؟ ..... جوکھو۔ 'اچھا تو سنو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہاری طرح ہو۔ ایسی ہی لجانے والی ہو۔ ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو۔ ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو۔ ایسی ہی کفایت شعار ہو۔ ایسی ہی ہنس مکھ ہو، بس ایسی عورت ملے گی تو بیاہ کروں گا نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔' پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ پیچھے ہٹ کر بولی ! تم بڑے دل لگی باز ہو۔"

اسی طرح افسانہ "نئی بیوی" کے آخری جملے سرگوشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور عورت کے بنیادی رجحان پر اثر انداز ہوتے ہیں :

" ... ... بیوی جس کام کے لیے ہے اُسی کے لیے ہے ، " آخر بیوی کس کام کے لیے ہے ؟" "آپ مالک ہیں نہیں تو بتلا دیتا بیوی کس کام کے لیے ہے ۔"

... ... نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر آگیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی ۔ "لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے ، تم ذرا آجانا ۔"

واوین میں لکھے گئے یہ آخری فقرے قاری کو حیرت واستعجاب میں ڈال کر ایک ایسے نقطۂ ارتکاز پر لے آتے ہیں جہاں معانی اور مفاہیم کے کئی در کھلتے ہیں۔

آٹھواں افسانہ "گلی ڈنڈا " ہے۔ یہ افسانہ پہلی بار ہندی رسالہ 'ہنس' میں فروری ۱۹۲۹ء میں چھپا تھا۔ اردو میں اسی عنوان سے مجموعہ میں شامل ہے۔ افسانہ کا موضوع اس دور کی افسانوی روایات سے ذرا ہٹ کر ہے۔ اس کے ذریعہ پریم چند جہاں ہندوستان میں انگریزی کھیلوں پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہیں وہیں ہندوستانی کھیل 'گلی ڈنڈا' کے توسط سے بچپن کی بھولی بسری یادوں کو سمیٹتے ہوئے انسانیت اور محبت کا پیغام دیتے ہیں۔

افسانہ کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے :

" ہمارے ہاں انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجہ ہے ۔ ... لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے ۔"

گلی ڈنڈے کا شوق پریم چند کو اوائل عمر سے تھا :

" اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں ۔"

اپنے اس شوق کا ذکر وہ عمر کے آخری حصے تک کرتے رہے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء کو جب وہ فلمی دنیا سے بددل ہو کر بمبئی سے بنارس واپس آرہے تھے تو راستے میں اپنے دوست پنڈت ماکھن لال چترویدی کے ہاں کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں چند دنوں کے لیے رک گئے۔ ڈاکٹر کمل کشور ، وشو گوئنکا کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں کہ پریم چند ایک روز اپنے دوستوں کے ساتھ

ندی کنارے گھومنے گئے۔ وہاں کے پرسکون ماحول نے ان کے بچپن کی یادوں کو گدگدایا تو انھوں نے وہیں پڑی ہوئی ایک لکڑی سے گلّی اور ڈنڈا بنایا پھر کھیلنے لگے۔ بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے اس افسانہ میں پریم چند نے رشتوں ناطوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کھیل کھیل میں، اونچ نیچ اور ذات پات کے بندھنوں پر بھرپور طنز کیا ہے اور چھوٹے بڑے کی تمیز کو مٹانے والے اس قومی کھیل کو سراہتے ہوئے تفرقہ کو مٹانے کا محرک ثابت کیا ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے انھوں نے اس افسانہ میں بچپن اور جوانی کا مقابلہ بڑے دلچسپ ڈھنگ سے کیا ہے کہ بچپن مجموعہ ہے خلوص، محبت، بے باکی، انصاف اور سچائی کا۔ پور، پور بڑھتی اس عمر میں ذات برادری، اونچ نیچ یا مصلحت کوشی کا قطعاً احساس نہیں ہوتا ہے جب کہ بڑے ہونے پر جیسے جیسے شعور بالغ ہوتا جاتا ہے، سماجی کثافت ذہنوں کو پراگندہ کرنا شروع کرتی ہے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب کی تمیز و تفریق پیدا کرتی ہے غیر فطری اور کھوکھلے جذبات محبت اور خلوص کی قدروں کو پائمال کرتے ہیں جس سے انسانیت مجروح ہوتی ہے پریم چند نے زندگی کی ان ہی حقیقتوں کو "گلی ڈنڈا" میں بڑے سیدھے سادے لیکن منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

نواں افسانہ "سوانگ" ہے جو جامعہ جنوری ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں اسی عنوان سے شائع ہوا۔ اس افسانے کے ذریعہ پُر مذاق پیرایہ میں پریم چند نے دو راجپوت خاندانوں کے وقت کے ساتھ بدلتے مزاجوں کا منظر نامہ پیش کیا ہے شہر میں پڑھنے لکھنے، کاروبار کرنے کے بعد جہاں علم اور تجربہ نے راجپوتی دبدبہ میں سوچ و فکر کا عنصر زیادہ پیدا کر دیا ہے وہیں دیہات میں رہتے ہوئے راجپوتی روایات کا اثر قدیم شکل میں برقرار رہا ہے کہ جیسا اس قوم میں خودداری، عزت نفس اور جذبہ ایثار پایا جاتا تھا۔ پریم چند نے اس تبدیلی کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے واقعات کی جو نشست کی ہے وہ اگرچہ ایک مزاحیہ شکل ہے لیکن اس میں انھوں نے افسانے کے ہیرو گجندر سنگھ کے کردار میں علم اور دانشوری کے عنصر کو بدرجہ اتم برقرار رکھا ہے اور وہ باوجود اپنی تمام کمزوریوں کے اپنی ذہانت سے خوبصورتی کے ساتھ ان کمزوریوں کا جواز پیش کر کے انھیں دوسرے معنی دے دیتا ہے

پریم چند نے قدیم روایات یا بے سوچی سمجھی بہادری کے جذبے کو بدلتے ماحول میں علم سے جوڑ کر نئی سمت عطا کی ہے۔

دسواں افسانہ "انصاف کی پولیس" ہے جو پہلی بار ہندی میں "خدائی فوجدار" کے عنوان سے چھپا تھا اس کا اردو ترجمہ مذکورہ مجموعہ میں شامل ہے پریم چند کا یہ افسانہ اشتراکی نقطۂ نظر پر مبنی ہے افسانہ کا مرکزی کردار سیٹھ نانک چند محض ایک لوٹا ڈور لے کر گاؤں میں آیا تھا اور اپنی بے ایمانی، اور سودخوری کے کاروبار سے غریب، ضرورت مند اور بے بس انسانوں کا استحصال کر کے سیٹھ نانک چند بن گیا تھا وہ پانچ ہزار روپیہ سالانہ ٹیکس انگریزی سرکار کو ادا کرتا تھا اور آفیسران کو مفت مال سپلائی کر کے ان کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ بلکہ اپنی ساکھ بنائے رکھتا تھا تاکہ غریبوں کا اور بہتر طریقے سے استحصال ممکن ہوسکے۔ یہی سیٹھ نام و نمود اور علاقے میں اپنی مذہب پرستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے سود کی رقوم سے مندر بنوانے کی تدبیر کر رہا تھا کہ اسی درمیان اُسے انصاف کی پولیس کی جانب سے خطوط ملنے لگتے ہیں کہ وہ ۲۵ ہزار روپیہ دے ورنہ ڈاکہ ڈالا جائے گا۔ پہلے تو نانک چند اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا پھر سوچتا ہے کہ پولیس میں جاؤں گا تو ان کو بھی پوجنا پڑے گا اور مطلب حل نہ ہوگا اس اعتبار سے وہ خود اس سے بچاؤ کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ ایک دن پولیس کے سپاہی اس کے گھر پہنچ کر بتاتے ہیں کہ داروغہ جی نے سیٹھ کی حفاظت کے لیے انھیں بھیجا ہے سیٹھ کو مزید یقین دلانے کے لیے اسے اس قدر سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنا سارا مال پولیس کی موٹر گاڑی میں رکھ کر تھانے میں جمع کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے سیٹھ جی کا مال اور سیٹھ جی کو لے کر جب پولیس والے گاڑی سے چلتے ہیں تو ہیڈ کانسٹیبل سیٹھ جی سے سوالات کر کے ساری روداد معلوم کر لیتا ہے اور انھیں ایک جگہ گاڑی سے اتار کر بتاتا ہے کہ وہ انصاف کی پولیس والے ہیں اور سیٹھ جی کو مشورہ دیتا ہے کہ اپنا کاروبار نئے سرے سے شروع کریں۔ جب ان کے پاس مال ہو جائے گا تو پھر ہم لوگ آئیں گے گاڑی چلی جاتی ہے سیٹھ جی ہانپتے، کانپتے، چیختے رہ جاتے ہیں۔ اس افسانہ میں پریم چند نے ہندوستانی ساہوکاروں کے استحصال کی بھرپور عکاسی کی ہے اور معاشرے میں نہ صرف ان کے دباؤ کا بیان کیا ہے بلکہ اس کا علاج بھی انھوں نے دجیبا کرنا

ویسا بھرنا سے نکالا ہے۔ آج بھی یہی جابرانہ نظام قائم ہے غریبوں اور بے بسوں کا استحصال ہو رہا ہے لیکن انصاف اور مساوات کہیں بھی نظر نہیں آرہا ہے۔

گیارہواں افسانہ "غم نہ داری بزبخر" ہے ہندی میں یہ افسانہ ان کی کہانیوں کے مجموعہ گپت دھن، جلد ۲ میں 'کوئی دکھ نہ ہو تو بکری خرید لو' کے نام سے شامل ہے اس مزاحیہ افسانہ کا پلاٹ ایک خاندان میں دودھ کی کمی کو رفع کرنے کی خاطر بکری پالنے کے حادثہ پر منحصر ہے لیکن اس بکری پالنے کے پیچھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں اس کا بہت عمدگی سے خاکہ کھینچا گیا ہے اور یہ پیغام دیا گیا ہے کہ جو چیز سہولت سے دستیاب ہو جائے اس کے لیے اتنے جنجال پالنے کی ضرورت نہیں ہے بکری صاحبہ جس طرح مالک کو پریشان کرتی ہیں وہ ہی لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو اس مصیبت سے گزرے ہیں۔ اس میں پریم چند کا کمال یہ ہے کہ ان واقعات کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے جس سے قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بارہواں افسانہ "مفت کرم داشتن" ہے یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں "مفت کا یش" کے عنوان سے 'ہنس' اگست ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا اس افسانہ میں پریم چند نے جان پہچان سے سفارشوں کے طریقہ کار کو بیان کیا ہے بیانیہ انداز میں یہ افسانہ ایک ایسے شخص کے گرد گھومتا ہے جسے حاکم نے کسی ذاتی دلچسپی کی بنا پر ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ لیکن یہی واقعہ اس شخص کے لیے مصیبت بن گیا اور لوگ اس کو اپنی سفارش کرانے کے لیے مجبور کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ایک ذاتی ملاقات سفارشوں کا بوجھ کیسے برداشت کر سکتی تھی لیکن خود بخود ہو جانے والے کاموں میں بھی اس شخص کی سفارش کا اثر محسوس کیا جانے لگا تھا۔ مزاحیہ لب ولہجہ میں لکھے اِس افسانہ کی اہمیت آج بھی برقرار ہے کیوں کہ سفارشوں کا سلسلہ دورِ حاضر میں بھی اسی ٹھاٹ باٹ سے چل رہا ہے۔

تیرھواں افسانہ قاتل کی ماں ہے۔ مجموعہ کا یہ آخری افسانہ ہندی میں پریم چند کی اہلیہ شیورانی دیوی کے نام سے شائع ہوا تھا جب کہ اردو میں خود پریم چند نے اسے اپنے مجموعہ "واردات" میں شامل کیا۔ اس افسانہ میں پریم چند نے اپنے عہد میں جذبہ حریت

سے بھرپور نوجوانوں کی تحریک کو قتل وخوں ریزی کے واقعات سے جوڑا تو ہے لیکن یہ پہلو بھی اُجاگر کیا ہے کہ ایسے پاک جذبہ کو اِن جرائم میں ملوث کرکے بے قصوروں کو پھانسی چڑھوانے سے بہتر ہو کہ خود سامنے آیا جائے۔ دراصل پریم چند حب الوطنی اور انگریزوں کے خلاف بیدار ذہنیت کو تشدد کی راہ نہ چلنے کے بجائے عدم تشدد کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔ جس میں ایک ماں کے کردار کو بخوبی واضح کیا ہے رامیشوری کا اکلوتا لڑکا ونود جب کسی افسر کا خون کرکے گھر آتا ہے اور اسے اپنا حال بتاتا ہے تو ماں کو یہ دکھ ہوتا ہے کہ اس کے بیٹے کے افعال سے بے قصور سزا پائیں گے وہ اُسے پھٹکارتی ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو مردانہ وار سامنے آئے۔ لڑکا ناراض ہو کر چلا جاتا ہے رامیشوری کو چین نہیں وہ کانگریس آفس اور عدالت تک جا پہنچتی ہے اور جب وہ لوگ جو بے قصور تھے عدالت میں پیش ہوتے ہیں تو رامیشوری حقیقتِ حال سے مجسٹریٹ کو مطلع کرتی ہے۔ عدالت میں افراتفری مچ جاتی ہے اور اسی درمیان مجمعے میں سے نکل کر ونود اپنی ماں کے سینے میں خنجر اُتار دیتا ہے رامیشوری مرجاتی ہے۔ پریم چند نے اہنسا کے جذبے کو ابھارنے کے لیے افسانہ کا جو پلاٹ چُنا ہے وہ واضح طور پر کانگریس میں گرم دل اور نرم دل کی صورت میں سیاسی طور پر اُبھر چکا تھا۔ لیکن گاندھی جی چونکہ اہنسا کے پجاری تھے اور عوام میں ابھی ہنسا کی جانب رجحان نہیں تھا۔ عموماً دانشور ایسے دوراہے پر آ کھڑے ہوئے تھے جہاں ہنسا اور اہنسا کے سوال پر دو آراء پیدا ہوگئی تھیں کرداروں میں ونود ایک نوجوان، اس دور کے جوشیلے جوانوں کی نمائندگی کرتا ہے تو رامیشوری بھگوان سے ڈرنے والی اور ہنسا کے مخالفین کی نمائندہ ہے۔ جو اپنے اکلوتے بیٹے کو تلقین کرتی ہے کہ اگر تو نے یہ جرم کیا ہے تو سامنے آکر قبول کر، تیرے پیچھے بے قصور کیوں سزا پائیں۔ ماں کا کردار افسانہ میں کچھ مشتبہ نظر آتا ہے کیوں کہ وہ دوسروں کو بے قصور ثابت کرنے کی بہ نسبت اپنے بیٹے کو قاتل ثابت کرنے کی فکر میں زیادہ نظر آتی ہے۔ اِس واہمہ کو تقویت اُس کی عُجلت پسندی سے ملتی ہے کیوں کہ قاری کے ذہن میں یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ بھی ممکن تھا کہ تمام ملزمین جرم ثابت نہ ہونے پر چھوٹ جاتے لیکن اس نے عدالت

کی کارروائی مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس وسوسہ کے باوجود واقعات کی بُنت، اس میں ڈرامائی کیفیت افسانہ کو بہت جاندار اور پراثر بنا دیتی ہے اور یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ جوش میں انسان کو پاکیزہ رشتوں اور محبتوں کا بھی احساس نہیں رہ جاتا ہے۔

اِس اعتبار سے مذکورہ مجموعہ میں شامل افسانے پریم چند کے منتخب افسانے کہے جا سکتے ہیں جیسا کہ پروفیسر قمر رئیس نے "تلاش و توازن" میں لکھا ہے:

"اس مجموعے کے لیے انھوں نے ہندی سے اپنی بہترین اور نمائندہ کہانیوں کا انتخاب کیا ہوگا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ "واردات" میں ان کی اس دور کی بہترین کہانیاں شامل ہیں۔" ص ۱۲۵

البتہ میرے نقطۂ نظر سے "غم نہ داری بُز بخر" اور "مفت کرم داشتن" ایک طرح سے دلچسپ انشائیے ہیں جو افسانوی انداز میں لکھے گئے ہیں اسی لیے اِن انشائیہ نما افسانوں میں افسانوی عنصر کی کمی ہے پھر بھی اپنے زمانے کے لحاظ سے ان کی اپنی ادبی قدر و قیمت ہے پریم چند کے عہد میں اِس طرح کے انشائیوں کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں کو چھوڑ کر "واردات" کے بقیہ گیارہ افسانے ہندوستان کے عہد غلامی کے مسائل پر فکر انگیز خیالات کا برملا تخلیقی اظہار ہیں۔ خاص طور سے بیوہ کے دردناک موضوع پر "معصوم بچہ"۔ "بد نصیب ماں"۔ "روشنی"۔ "مالکن" میں کچھ نہ کچھ جھلک ملتی ہے جبکہ "شکوہ شکایت" مکمل طور پر اس زمانے کے انسانی رشتوں کا منظر نامہ ہے۔ "گلی ڈنڈا" میں اونچ نیچ، چھوٹے بڑے، ذات پات کی نفی کی گئی ہے۔ "سوانگ" مزاحیہ ہوتے ہوئے بھی بامقصد ہے۔ "انصاف کی پولیس" اشتراکی نقطۂ نظر سے دولت کی غلط تقسیم اور استحصال کے خلاف زبردست انتباہ ہے اور "قاتل کی ماں" میں اہنسا کے پیغام کو بہت بھرپور طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی افادیت اور اہمیت کا اعتراف پریم چند کے ہمعصر افسانہ نگار لطیف الدین احمد ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"بے رحم زندگی انسانوں کو کس کس طرح ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ منشی جی اس کو

نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اسی کو میں ان کا وہ خاص مقصد باور کرتا ہوں جو ان کے بیشتر افسانوں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے۔ وہ انسان کی خطاؤں کا انکشاف کرتے ہیں مگر اس طرح کہ قصوروار بے قصور محسوس ہوتا ہے کیوں کہ منشی جی ان حالات اور اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے جو انسان کو قصوروار بنانے کا موجب ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ وہ معاشرت کی ناہمواریاں اور تضاد بیان کرکے لطیف طنز بھی کر جاتے ہیں۔ منشی جی کے کردار ذہنی اعتبار سے زیادہ بلند نہیں ہوتے لیکن ان کے منہ سے وہ اس طرح زندگی اور معاشرت کے فلسفوں کے نازک پہلوؤں کو سادگی سے بیان کر دیتے کہ کسی طرح غیر متناسب بات معلوم نہیں ہوتی۔ میں اسے مشاہدے کے ساتھ مصنف کے احساس اور اظہار کا کمال سمجھتا ہوں۔"

(زمانہ، کانپور، مارچ ۱۹۳۸ء)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کا یہ مجموعہ ان کے افکار و خیالات، عصری صورتِ حال پر ان کی نگاہ عمیق اور فن افسانہ نگاری پر ان کی زبردست دسترس کا ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس کی سیر، ہمیں جدید اردو فکشن کے اولین افسانہ نگار کی جملہ صلاحیتوں سے واقف کراتی ہے۔ آج تک ہماری تنقید جن خطوط پر فن پارے کے تعلق سے سوچتی اور اظہار کرتی آئی ہے ان سبھی کے مطابق پریم چند کا فن اور بطورِ خاص 'واردات' میں پیش کردہ فن پارے ایک مثبت تاثر چھوڑتے ہیں جو دیرپا ہے اور ہر دور کے (تبدیل ہوتے ہوئے) معیاراتِ تنقید پر پریم چند کے افسانے پورے اترتے ہیں۔

"منشی پریم چند کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ شاید
ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ایک آدھ کتاب ان کی
نظر سے نہ گزری ہو۔ اس کے ساتھ ہی حافظہ بھی بلا کا تھا۔
قصہ کہانی کی کتابیں پڑھنا اور ان کو یاد رکھنا تو کوئی
قابلِ تعریف بات نہیں، لیکن منشی پریم چند علمی و سیاسی
کتب و رسائل کے اہم مطالب کو اس طرح دہرا دیا
کرتے تھے گویا پڑھ کر سنا رہے ہیں۔"

پیارے لال شاکر میرٹھی

کتابیات

اردو

۱۔ احساس وادراک، نظیر احمد صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء

۲۔ ادب اور شعور، ممتاز حسین اردو اکیڈمی سندھ، مشن روڈ، کراچی

۳۔ اردو ادب کی ایک صدی، ڈاکٹر سید عبداللہ چمن بکڈپو، اردو بازار، دہلی، ۱۹۷۳ء

۴۔ اردو فکشن، مرتب پروفیسر آل احمد سرور اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

۵ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء

۶۔ اردو ناول پریم چند کے بعد، ڈاکٹر ہارون ایوب اردو پبلشرز، لکھنؤ

۷۔ افسانہ حقیقت سے علامت تک، سلیم اختر اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۸۰ء

۸۔ افکار و مسائل، پروفیسر احتشام حسین نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

۹ اہلِ ہند کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر تارا چند اردو اکیڈمی دلی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء

۱۰۔ آج کا اردو ادب، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۵ء

۱۱۔ بیسویں صدی میں اردو ناول، پروفیسر عبدالسلام

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء

۱۲۔ بیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست

نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد، دسمبر ۱۹۷۳ء

۱۳۔ پریم چند، ہنس راج رہبر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مئی ۱۹۵۹ء

۱۴۔ پریم چند، پرکاش چندر گپت، مترجم ل۔ احمد اکبر آبادی ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی
۱۵۔ پریم چند فن اور تعمیر فن، ڈاکٹر جعفر رضا شبستان، ۲۱۸۔ شاہ گنج، الہ آباد ۱۹۷۷ء
۱۶۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر قمر رئیس سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۸ء
۱۷۔ پریم چند کہانی کا رہنما، ڈاکٹر جعفر رضا رام نراین لال بینی مادھو، الہ آباد ۱۹۶۹ء
۱۸۔ پریم چند کے مختصر افسانے، مرتب رادھا کرشن
نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی ۱۹۷۸ء
۱۹۔ پریم چند کے ناولوں کے نسوانی کردار، شمیم نکہت نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۷۵ء
۲۰۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل
انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۷۶ء
۲۱۔ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرتبہ خورشید احمد
اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، جلد اوّل ۱۹۶۸ء
۲۲۔ تحریکِ خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء
۲۳۔ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، ڈاکٹر صادق
اردو مجلس، ۶۷۷ بازار چتلی قبر، دہلی ۱۹۸۱ء
۲۴۔ تلاش و توازن، ڈاکٹر قمر رئیس
ادارہ خرام پبلیکیشنز، حوض قاضی دہلی ۶ اپریل ۱۹۶۸ء
۲۵۔ تلاشِ ہند، جواہر لال نہرو مکتبہ جامعہ، دہلی، دسمبر ۱۹۴۶ء
۲۶۔ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۴ء
۲۷۔ ترقی پسند ادب، سردار جعفری اشاعت اردو، حیدر آباد (دکن) ۱۹۴۵ء
۲۸۔ تنقیدی تجربے، ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۵۹ء
۲۹۔ تنقیدی تناظر، ڈاکٹر قمر رئیس ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۸ء
۳۰۔ تحریریں، ڈاکٹر گیان چند ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، طبع سوم ۱۹۵۵ء
۳۱۔ جدوجہد آزادی میں مرکزی مجلسِ قانون ساز کا رول، منورنجن جھا، مترجم غلام ربانی تاباں

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۷۳ء

۳۲۔ جدید ہندوستان میں ذات بات، ایم۔این۔سری نواس، مترجم شہباز حسین
نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، فروری ۱۹۷۴ء

۳۳۔ خدنگ غدر، معین الدین حسن خاں، مقدمہ خواجہ احمد فاروقی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

۳۴۔ داستان سے افسانے تک، وقار عظیم مکتبۂ الفاظ، علی گڑھ، ۱۹۸۰ء

۳۵۔ دنیائے افسانہ، عبدالقادر سروری مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۵ء

۳۶۔ دید و دریافت، نثار احمد فاروقی آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی ۶ طبع اوّل ۱۹۶۴ء

۳۷۔ روایت اور بغاوت، سید احتشام حسین
ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد، ستمبر ۱۹۴۷ء

۳۸۔ روشنائی، سید سجاد ظہیر آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۹ء

۳۹۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر نعیم احمد
ادبی اکاڈمی، آفتاب منزل، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

۴۰۔ غدر کے چند علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی
نیا کتاب گھر، اردو بازار، دہلی

۴۱۔ قلم کا مزدور، مدن گوپال مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، مئی ۱۹۶۶ء

۴۲۔ ماڈرن انڈین پولیٹیکل تھاٹ، ڈاکٹر وشوناتھ پرساد ورما
پانچواں ایڈیشن، ۱۹۷۴ء

۴۳۔ مکمل تاریخ آزاد ہند فوج، اسرار احمد آزاد
نیا کتاب گھر، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

۴۴۔ منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے، قمر رئیس ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۴۵۔ نوائے آزادی، مقدمہ عبدالرزاق قریشی ادبی پبلشرز، بمبئی ۸، ۱۹۵۷ء

۴۶۔ نیا ادب، مرتب قاضی عبدالغفار
ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد (دکن)، ۱۹۴۴ء
۴۷۔ نیا افسانہ، وقار عظیم ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
۴۸۔ نئے تناظر، وزیر آغا اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۷۹ء
۴۹۔ ہماری آزادی، ابوالکلام آزاد، ترجمہ محمد مجیب ب ت
۵۰۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، عبداللطیف، مرتبہ خلیق احمد نظامی
ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی، اکتوبر ۱۹۵۸ء

ہندی

۱۔ آدھونک ہندی کتھا ساہتیہ اور منووگیان، ڈاکٹر دیوراج اپادھیائے
ایس۔ چاند اینڈ کمپنی، دہلی، ۱۹۶۴ء
۲۔ اُپنیاس سمراٹ پریم چند، شیونراین شریواستو
پرکاشن وبھاگ، بھارت سرکار، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء
۳۔ بھارت کا راشٹریہ آندولن ایوم سنودھانک وکاس، ڈاکٹر جی۔ ڈی۔ تیواری
میناکھشی پرکاشن، میرٹھ، ۱۹۷۷ء
۴۔ بھارت بھومی کا اتہاس، شیونراین سنگھ رانا
ہندی پرچارک سنستھان، وارانسی، ۱۹۷۹ء
۵۔ پریم چند، ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر کتاب محل، الہ آباد، ۱۹۴۸ء
۶۔ پریم چند، ڈاکٹر گنگا پرساد بمل راج کمل پرکاشن، دہلی، ۱۹۶۸ء
۷۔ پریم چند اور ان کا یگ، ڈاکٹر رام بلاس شرما
مہر چند منشی رام، دہلی، ۱۹۵۲ء
۸۔ پریم چند ایک ادھین، ڈاکٹر راجیشور گورو

مدھیہ پردیش پرکاشن سمیتی، بھوپال، ۱۹۶۱ء

۹۔ پریم چند قلم کا سپاہی، امرت رائے ہنس پرکاشن، الہ آباد، ۱۹۶۲ء

۱۰۔ پریم چند اور گرام سمسیہ، ڈاکٹر پریم نراین ٹنڈن

رام پرساد اینڈ سنس، آگرہ، ۱۹۶۱ء

۱۱۔ پریم چند اور گاندھی واد، ڈاکٹر رام دین گپت

ہندی ساہتیہ سنسار، پٹنہ، مارچ ۱۹۶۱ء

۱۲۔ پریم چند گھر میں، شیورانی دیوی آتمارام اینڈ سنس، دہلی، ۱۹۵۶ء

رسائل

۱۔ ادیب، ماہنامہ، ستمبر ۱۹۱۰ء تا اپریل ۱۹۱۳ء، مدیر نوبت رائے نظر لکھنوی

۲۔ الفاظ، دو ماہی، علی گڑھ، جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء، مدیر ڈاکٹر اطہر پرویز

۳۔ الفرقان، ماہنامہ، بریلی، شاہ ولی اللہ نمبر، طبع دوم ۱۹۴۱ء

۴۔ امکان، سہ ماہی، بمبئی، جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء، مدیر حسن کمال

۵۔ آج کل، ماہنامہ، دہلی، پریم چند نمبر اگست ۱۹۸۰ء، مدیر شہباز حسین

۶۔ 〃 〃 〃 〃 فروری ۱۹۸۰ء

۷۔ 〃 〃 〃 〃 حسرت موہانی نمبر، اگست ستمبر ۱۹۸۱ء

مدیر راج نراین راز

۸۔ پرواز ادب، ماہنامہ پنجاب، نومبر ۱۹۸۰ء، مدیر رجنیش کمار

۹۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، پریم چند نمبر ۱۹۳۶ء، مدیر دیا نراین نگم

۱۰۔ 〃 〃 〃 ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۶ء تک

۱۱۔ سہیل، ماہنامہ، گیا، پریم چند نمبر جنوری فروری ۱۹۸۰ء، مدیر ادریس سہسارودی

۱۲۔ فروغ اردو، ماہنامہ، لکھنؤ، پریم چند نمبر، اپریل تا اگست ۱۹۸۰ء، مرتب سعادت علی صدیقی

۱۳۔ شاعر، ماہنامہ، بمبئی، جون ۱۹۷۱ء، مدیر اعجاز صدیقی
۱۴۔ کتاب نما، ماہنامہ، دہلی، پریم چند نمبر، جون ۱۹۸۱ء، مرتب عبد القوی دسنوی
۱۵۔ کہانی کار، سہ ماہی، وارانسی، پریم چند نمبر، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۱ء (ہندی) مدیر کمل گپت
۱۶۔ نگار، ماہنامہ، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء، مدیر نیاز فتحپوری

ڈاکٹر صغیر افراہیم اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں میں سب سے کم عمر صاحب تصنیف ہیں۔ ''پریم چند۔ ایک نقیب'' بالغ ہوتی ہوئی نگاہِ نقد کا پریم چند کے حضور میں محض ایک خراج عقیدت ہی نہیں بلکہ اردو فکشن کی تنقید کے کینویس کو وسیع اور محترم کرنے کی مبارک کوشش ہے جس کے لیے وہ ستائش کے مستحق ہیں۔

چوتھائی صدی قبل میں نے کہا تھا کہ فکشن کے ساتھ اردو تنقید نے وہی سلوک کیا ہے جو کیکئی نے رام کے ساتھ کیا تھا اور میں آج بھی اپنی رائے پر قائم ہوں اس لیے کہ ہر چند فکشن کو موضوع تنقید بنایا گیا سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کا جواز پیدا کرنے لیے بھی کچھ لکھا گیا لیکن وہ دلسوزی اور خوں جگری جو تنقید کو تخلیق کے قریب لے آتی ہے ہنوز ناپید ہے تاہم اس کتاب میں ادب سے اس ذوق وشوق کا اظہار ہوا ہے جس کی ارزانی فکشن کی تنقید کو امیر بنا سکتی ہے۔ پریم چند پر اب بھی اتنا نہیں لکھا گیا جتنا لکھا جانا چاہیے تھا۔ صغیر افراہیم نے پریم چند کے مطالعے کے ایک تشنہ پہلو کو بھی اپنی روشنائی سے سیراب کرنے کی جسارت کی ہے۔

پروفیسر قاضی عبدالستار